TIGHT BINDING BOOK

UNIVERSAL LIBRARY
OU_222199
UNIVERSAL LIBRARY

OSMANIA UNIVERSITY LIBRARY

Call No. ۸۹۱٫۵۴۳۳۳ Accession No. ۱۴۷۵۱ 14751

Author رشید اختر ندوی ان ب ج

Title یادِ یاراں

This book should be returned on or before the date last marked below.

پہلا باب

یہ بڑی اندھیری رات تھی ، سردیوں کی رات ۔ باہر بڑے زور کی بارش ہو رہی تھی ۔ ہوا کے جھکّڑ چل رہے تھے ۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے قضا و قدر کے فرشتے اپنی قدرت اور طاقت کے سارے مظاہرے آج ہی کر دینے والے ہیں ۔

ان تینوں بدنصیب بہنوں کو اپنی بے ہوش اور قریب المرگ بیمار ماں کے لئے جاگتے اور روتے آج تین راتیں ہو چکی تھیں ۔ ننھی زہرہ یوں تو ان سب سے چھوٹی تھی ۔ عمر ہی کیا ، صرف نو سال کی تھی ۔ مگر ماں کی تیمارداری میں وہ ان سب سے بڑھ گئی تھی ۔ کچھ تو اپنی ہانت کی وجہ سے اور کچھ اس لئے کہ منجھلی لڑکی صابرہ موٹی موٹی خوبصورت آنکھیں رکھنے کے باوجود بینائی سے محروم تھی اور آپا سائرہ خود بیمار تھی اس کے جگر میں ورم تھا ۔

مگر اس اندھیری اور طوفانی رات میں تینوں جاگ رہی تھیں ۔ آپا سائرہ نے اپنا بستر ماں کے سرہانے سے بالکل ملا کر زمین ہی پر بچھا لیا تھا ۔ اور ایک پرانے سے گاؤ تکیہ پر اپنے بیمار سینہ کو رکھے ، منہ ماں کی پٹی پر رکھ دیا تھا ۔ اور آنکھیں تھیں کہ آنسوؤں کی نہریں بن گئی تھیں ۔ اور غریب صابرہ کا منہ بھی ماں کی پٹی پر تھا ۔ اور وہ دونوں ہاتھ ماں کے سینہ پر رکھے تھے ۔ وہ کچھ دیکھ نہ سکتی تھی ۔ اس کا جی اپنی اس بیمار ماں کے مُرجھائے

چہرہ کو دیکھنے کے لئے بہت بُری طرح تڑپ رہا تھا۔ اور دل کی یہ تڑپ اس کی موٹی موٹی بے بصیرت آنکھوں میں پہنچ کر آنسوؤں کی صُورت اختیار کرتی جا رہی تھی۔

معصُوم زہرہ، البتہ چُپ چاپ تھی۔ اتنی سی عمر تھی اس کی مگر کتنا صبر اور کتنی دانائی تھی اس میں کہ وہ ان دونوں کے بیچ میں بیٹھی اپنے دونوں ننھّے ننھّے ہاتھ ان کی پیٹھوں پر رکھے تھے۔ اور روتے ہوئے کہتی جا رہی تھی

بڑی آپا بی، منجھلی آپا بی، روؤ نہیں، رونے سے کیا ہوتے ہے۔

اور پھر... بچّوں کے رونے سے ماؤں کی بیماریاں تو بڑھ جاتی ہیں۔

اس نے یہ کہتے وقت ان دونوں کی طرف اس معصومیت کے ساتھ دیکھا کہ دونوا کانپ اٹھیں اور خاموش اور مدہم رفتار سے بہنے والے آنسو دونوں کے سینوں میں رکنے اور دونوں نے سسکیاں بھر بھر کر اس معصُوم کو اپنے سے لپٹا لیا۔

اچانک بجلی زور سے کوندی۔ ہوا کا ایک خوفناک تھپیڑا کمزور کھڑکی کے مُنہ زور کے ساتھ آن پڑا کہ کھڑکی ایک زور کے جھٹکے کے ساتھ کھل گئی۔ اور بارش کا ایک ریلا کے بستر پر لپکا۔

وہ تینوں ایک دوسرے سے لپٹی بُری طرح سہم گئیں۔ غم کے اس طوفان نے سینوں میں جوش مار رہا تھا۔ ان کی آنکھوں کو سی دیا تھا۔ مگر ماں بھیگ گئی تھی۔ اور لپکے متواتر اس کے منہ پر آن آن کر گر رہے تھے۔ ان لپکوں نے اس کی بے ہوشی کو وہ بُری طرح چیخ اٹھیں۔ اور تینوں نے بُری طرح کانپ کانپ کر ایک دوسرے کو صابرہ کے دونوں ہاتھ ماں کی رضائی پر آن پڑے۔ سائرہ اور زہرہ دونوں گھبرا کر اٹھیں نے کھڑکی بند کی۔

صابرہ بہتی بہتی آنکھوں سے ماں کی بھیگی رضائی پر سے ہٹا کر اپنی خشک رضائی اس پر ڈال رہی تھی کہ زہرہ ماں سے لپٹ گئی ۔ کمرہ کا لمپ ہولے ہولے جل رہا تھا اور قدرت کی آنکھ اس عجیب کپکپاتے منظر کو دیکھ رہی تھی ۔ زہرہ کے ساتھ ساتھ صابرہ اور سائرہ بھی ماں سے لپٹ گئی تھیں ۔ اور ماں کے ضبط اور صبر کی طنابیں بری طرح کھنچ کر ٹوٹ گئیں ۔ رونے کی قوت نہ رکھنے کے باوجود وہ سسکیاں بھر رہی تھی ۔ اور یہ سسکیاں چند گھڑیوں کے اندر موت کی ہچکیاں بن گئیں ۔ اور یہ طوفانی رات ان تینوں کی زندگی کا ایک ہولناک طوفان بن گئی ۔

ماں کی موت پر رونے کو تو ہر کوئی روتا ہے ۔ مگر وہ تینوں اس طرح روئیں جیسے ان کے جسموں میں دوڑنے والے خون کا ہر قطرہ آنسو بن گیا ہے ۔

کمرہ کا لمپ بھی بھک بھک کرنے لگا تھا جیسے وہ بھی ان کے غم میں شریک ہو گیا ہے، اور آسمان اور زیادہ بری طرح رونے ، اور ہوا بہت زور سے چیخنے اور چلانے لگی تھی

دوسرا باب

سرہ پہاڑی پر اُگے ہُوئے ، لمبے لمبے چیل کے درختوں کے پیچھے دُور افق پر سُورج کا شرماتا اور بھیگا بھیگا چہرہ ، زرد زرد لال لال بادلوں کے ٹکڑوں کو چیرتا اُوپر کو اُٹھ رہا تھا اور اس کی زرد زرد لال لال کرنیں چیل کے بھیگے ہوئے پتوں پر ناچتی اس کھڑکی میں سے اندر کو آ رہی تھیں جس کے قریب رکھی چارپائی پر ان کی ماں کی نعش پڑی تھی ۔ سائرہ کے جگر کا درد بہت بڑھ گیا تھا اور وہ فرش پر بچھے ہوئے بستر پر اوندھے منہ گری پڑی سسکیاں بھر رہی تھی ۔

اور صابرہ اندھی اور مجبور صابرہ ماں کی ٹانگوں پر دونوں بازو پھیلائے اس طرح بیٹھی تھی جیسے بینائی کے ساتھ ساتھ اس کے حواس بھی اس سے روٹھ گئے ہیں ۔

مگر ننھی زہرہ ، کے حواس ابھی بیدار تھے اور احساسِ فرض بھی جاگ رہا تھا ۔ مگر وہ باہر کے دروازہ کے قریب آن کھڑی ہوئی تھی ۔ اور پانی کی جھیل بنے ہوئے صحن اور اس سے ملی ہوئی سڑک کو دیکھ رہی تھی ۔ دُور دُور تک پانی ہی پھیلا تھا ۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے قدرت اس میدانی علاقہ کو دریا بنا دیا ہے ۔

زہرہ غریب دروازہ پر کھڑی کھڑی تھک گئی تھی ۔ مگر اس کی سوچی سوچی آنکھیں

لب پانی کی اس جھیل پر سے پھسلتی دُور فاصلے پر بنے ہوئے مکانات کے دروازوں پر اُٹھی
ے۔ اس کے ننھے سے دل میں اس وقت صرف ایک ہی خواہش تڑپ رہی تھی کہ ان دروازوں
وئی مانوس چہرہ کھڑا نظر آجائے۔ مگر نہ جانے رات کے اس طوفان نے بستی کے
ارے باشندوں کو اس کی ماں کی طرح مار ڈالا تھا۔ یا لمحہ بہ لمحہ بڑھتی سردی نے ان کے
جسم منجمد کر دیئے تھے۔ کہ کوئی شخص باہر نہ نکلا اور ننھی زہرہ کی مایوس نگاہیں جھیل پر سے
پھسلتی اپنے ہی صحن پر آن رکیں۔

صحن میں لگے ہوئے چھوٹے سے باغیچہ کے کئی چھوٹے چھوٹے پودے اکھڑ کر پانی کی سطح پر تیر رہے تھے۔ اور اس کی ماں کے ہاتھوں سے لگا ہوا یہ ننھا سا باغیچہ موت کے ہچکولے کھا رہا تھا، اچانک ننھی زہرہ کا ذہن ایک شعلہ بداماں بھٹی کی صورت اختیار کر گیا اس کی سوچی سوچی آنکھیں انگاروں کی طرح دہکنے لگیں اور اس نے سوچا، یہ اللہ میاں بھی کتنے غصیلے ہیں جنہوں نے ان کی ماں کو مار ڈالا۔ اور اب اس باغیچہ کو موت کی نیند سلا رہے ہیں۔ کیا یہ آندھیاں، کیا یہ طوفان اور سیلاب میانہ روی اختیار نہیں کر سکتے؟ کیا یہ بھی اللہ میاں کی بات نہیں مانتے۔ ایسے ہی جیسے میں کبھی کبھی امی کی بات نہ مانا کرتی تھی جیسے ہی اس کا تصور اس نقطہ پر پہنچا۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اور دل کا غم الفاظ کی صورت اختیار کر کے اس کی زبان پر لرزنے لگا۔ وہ سسکیاں بھرتے اور کانپتے کانپتے اپنی امی کا نام لے کر پکارنے لگی تھی اور کہہ رہی تھی۔

اُمی! تم روٹھ گئیں، من جاؤ، میری اچھی امی،
اب، میں کبھی تمہارا کہنا نہ ٹالوں گی۔

اور جب غم اس کے ننھے سے سینہ کی دیواریں ہلانے لگا۔ تو وہ دیوانہ وار اند

طرف لپکی۔

آپا بی سائرہ ابھی تک اوندھے منہ پڑی تھیں۔ اور اندھی صابرہ کے دونوں بازو ماں کی رانوں پر رکھے تھے۔ اور غم اور نیند نے باہم سازش کر کے اس کی موٹی موٹی بے جان آنکھیں بند کر دی تھیں۔

ننھی زہرہ دیوانہ وار لپکی۔ اور ماں کے سینہ سے لپٹ گئی۔ اس نے اپنا ننھا سا سر ماں کے بے جان منہ پر رکھ دیا۔ وہ اپنے گال ماں کے زرد زرد گالوں پر رگڑنے اور اپنے ہونٹ ماں کے سیاہ اور نیلے ہونٹوں پر پھیرنے لگی۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھوں سے ماں کی بے نور بوڑھی آنکھیں کھول دیں۔ اور ان پر انگلیاں رکھ رکھ کر آہیں بھر بھر کر کہنے لگی۔

"امی! تم ہم سے روٹھ کر اپنے اللہ میاں کے پاس چلی گئی ہو۔ اللہ میاں کو تمہاری کیا ضرورت تھی۔ ان کے پاس تو بہت لوگ ہیں۔ بابا بھی تو وہیں ہیں۔ چچا بھی ہیں اور دادی جان بھی! تم کو تو ہمارے پاس رہنا تھا، تم تو کہتی تھیں۔ تم اللہ میاں کے پاس نہیں جاؤ گی۔

آپا سائرہ کی شادی کرو گی۔ اور پھر ان کے بچے پالو گی۔

نہ جانے کیسے سوتی صابرہ کے ہاتھ ماں کی رانوں سے ہٹ کر ننھی زہرہ کی پیٹھ پر آن رُکے۔ ننھی زہرہ کہتے کہتے رک گئی۔ اس نے سسکیاں بھرتے بھرتے اپنے دونوں ہاتھ ماں کے چہرہ سے ہٹا کر صابرہ کے گلے میں ڈال دیئے اور چیخنے لگی۔

"امی! تم آپا جی صابرہ کو بھی چھوڑ گئیں، بے چاری آپا بی صابرہ کی تو

آنکھیں کام نہیں کرتیں۔ ان کے کپڑے کون سیئے گا، ان کو روٹی کون کھلائے گا۔ اور ان کے سارے دوسرے کام کیسے ہوں گے؟

ہائے امی!

صابرہ کا بے حس دماغ جاگ اٹھا۔ اس نے زہرہ کو اپنے بازوؤں میں بھینچ بھینچ لیا۔ اور زہرہ بھنچی بھنچی چیخی۔

آپا بی صابرہ! تم نے امی کا کیا بگاڑا تھا؟ —— وہ تم سے کیوں روٹھ گئیں۔ تم تو ان کی ہر بات مانتی تھیں۔

اور آپا بی صابرہ کے جسم کی ایک ایک رگ اور نس نس نالہ بن گئی اور وہ بُری طرح چیخ کر رونے لگی۔

آپا بی سائرہ نے بھی کروٹ بدلی، اس کے حواس پر جیسے ان دونوں کی چیخیں ہتھوڑے بن کر گریں۔ اس نے اپنے سر کو بری طرح جھنجھوڑا، رضائی پرے پھینکی۔ اور دیوانہ وار اٹھ بیٹھی، اور ان دونوں کو اپنے بازوؤں میں بھینچ لیا۔

اور ان کی سسکیاں اور زیادہ زور پکڑ گئیں۔

اچانک باہر کے برآمدہ کی چھت میں لٹکے ہوئے مٹھو میاں بہت زور سے شور مچانے لگے۔ اس زور سے کہ ان کا شور ان تینوں کی سسکیوں پر غالب آگیا۔

زہرہ کی سسکیاں آپ ہی آپ رک گئیں۔ اس نے آپا بی سائرہ کے بازوؤں میں سے خود کو نکال لیا۔ اور باہر کو لپکی۔ اس کو اپنے اس مٹھو میاں سے بڑی محبت تھی ں کی موت کے غم نے اسے مٹھو میاں بھلا دیا تھا۔ مٹھو میاں کا شور جب ننھی کو اس کے ے کے قریب لے آیا۔ تو ننھی کے دونوں ہاتھ پنجرے کی طرف اٹھ گئے۔ اور وہ اس سے

اس طرح باتیں کرنے لگی جیسے مٹھو اس کا راز دار ہو۔

"اے مٹھو میاں۔ امی جان روٹھ گئی ہیں۔ ہم کو اور تم کو چھوڑ کر اللہ میاں کے پاس چلی گئی ہیں۔

"اب تمہیں چوری کون کھلائے گا؟"

اور اس مٹھو میاں نے جیسے اس کے غم کی انتہا پالی ہو، اس نے اپنی لال لال چونچ ننھی زہرہ کے ہاتھ پر رکھ دی۔ اور پھر ایک بار نہیں چیخا اور ننھی نے مٹھو میاں کے سارے پنجرے کو اپنے سینہ سے لگا لیا۔

اچانک اس ننھی زہرہ کے سر پر کسی نے ہاتھ رکھ دیا۔ یہ ہاتھ کتنا سرد اور کتنا نرم نرم تھا، مگر ننھی زہرہ کا سر تو بھٹی بنا ہوا تھا۔ اس بھٹی بنے ہوئے سر پر جیسے ہی یہ برفیلا دباؤ پڑا ننھی نے بہت تیزی کے ساتھ پیچھے کی طرف گھوم کر دیکھا۔ اور اپنے اور آپا بی صابرہ کے ہم جولی منور کو بھیگے بھیگے کپڑوں میں کھڑے دیکھ کر، زہرہ مٹھو میاں کو بھول گئی اور منور سے اس طرح لپٹ گئی، جیسے یہ اس کا ماں جایا بھائی ہو۔

اور منور کی معصوم اور گہری گہری زرد آنکھیں بہ نکلیں۔ زہرہ نے مٹھو میاں سے ابھی ابھی جو بات کہی تھی منور نے اسے سن لیا تھا۔ اور وہ یہ تو جان گیا تھا کہ زہرہ اور صابرہ کی امی مر چکی ہے۔ زہرہ اس سے لپٹی رو رہی تھی اور وہ غریب روتے روتے دل کے ساتھ سوچ رہا تھا۔

"اب صابرہ بی کو کپڑے کون پہنائے گا، کھانا کون کھلائے گا۔ اور یہ بی امی کتنی ہی اچھی تھیں۔ اس سے کتنا پیار کرتیں، بالکل بچوں کی طرح اسے چاہتیں۔ اور جب وہ اور صابرہ اکٹھے قرآن کا سبق پڑھ رہے ہوتے تو امی کس محبت کے ساتھ اس کے سر پر

رکھ دیتیں ۔ اور کس میٹھی زبان میں کہتیں شاباش بیٹے " اب میں کھانا پکالوں۔ تم صابرہ بی کو آج کا سبق یاد کرادو ۔ اور پھر تھوڑی دیر بعد یہ بی اماں کس محبت سے گھر کی روٹیاں پکا کر ان دونوں کے سامنے لا رکھتیں ۔

اور اس کے انکار کے باوجود اسے کس محبت سے کھلانے لگتیں ۔ اور یہ بی اب مر گئی تھیں ۔ اس نقطہ پر پہنچ کر منوّر کانپ اُٹھا اور اپنے آپ سے بیشتر زہرہ کو اپنے بازوؤں میں زور زور سے بھینچ کر چیخنے لگا۔

اور پھر چیختے چیختے ، اچانک زہرہ کو اپنے سے الگ کرکے اندر کی طرف لپکا۔ اور اندر آپا بی سائرہ اور صابرہ ابھی تک ایک دوسرے سے لپٹی رو رہی تھیں۔ منور بجلی کی طرح لپکا اور امّی بی کی بے جان نعش کے قریب آیا ۔ اور لڑکیوں کی طرح چیخ چیخ کر رونے لگا ۔ اور آپا بی سائرہ اور صابرہ نے ایک دوسرے کو چھوڑ دیا ۔ سائرہ بجلی کی سی تیزی سے اپنی جگہ سے اُٹھی اور اپنے دونوں ہاتھ منور کے کندھوں پر رکھتے ہوئے روتی ہوئی آواز میں کہنے لگی ۔

" منوّر بھیا ، امی جان ، ہمیں پیچھے چھوڑ گئی ہیں۔ ہائے اب کیا ہوگا ، اب اس بے ڈھنگی زندگی میں ہمیں کون سہارا دے گا "

اور نہ جانے کیسے روتا منور روتے روتے رک گیا ۔ اس نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر چاروں طرف دیکھا، اور پھر جیسے اس روتے ماحول اور ان بے آسرا ، لڑکیوں کے غم نے ، اس کے معصوم دل کو ایک جوان اور بلند ہمّت مرد کا دل بنا دیا ہو ۔ اس نے اپنے سر کو ایک زور کا جھٹکا دیا ۔ اور اس کے الفاظ کانپے ۔

آپا بی سائرہ ! میں سہارا بنوں گا تم سب کا ، نہ جانے بے حس صابرہ کو اس کی

چھنی ہوئی حِس اچانک کیسے واپس مل گئی۔ اس کی موٹی موٹی بے نور آنکھیں پہلے سے کہیں زیادہ پھیل گئیں۔ اور ماں کی پٹی پر رکھے ہاتھ منور کی ٹانگوں کو ٹٹولنے لگے۔ منور کا سر جھک گیا۔ اور صابرہ نے اس کی ٹانگوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے، اپنا معصوم مُنہ اُوپر کی طرف کرکے اسی مری مری آواز میں جیسے وہ کسی کنوئیں سے بول رہی ہو۔ منور سے پوچھا!

"اور مجھ اندھی کو روٹی کون کھلائے گا، کپڑے کون پہنائے گا۔"

اور منور کو ایسے محسوس ہوا جیسے اس کی اس ہم جولی نے اس کے نازک سر پر کوئی بڑا پہاڑ اٹھا کر رکھ دیا ہو۔ وہ ان سب کا سہارا تو بن سکتا تھا۔ مگر روٹی کھلانا اور کپڑے پہنانا اس کے بس کا روگ نہ تھا۔ وہ خود کو اپنی کم عمری کے باوجود مرد تو سمجھنے لگا تھا مگر روٹی پکانا اور کپڑے پہنانا تو عورتوں کا کام تھا۔ اس نے سوچا یہ کام وہ کیسے کر سکے گا۔ اور جو یہ کام کر سکتی تھی۔ وہ پاس کھڑی تھی۔ اور اپنے ننھے سے مُنہ کو آگے کی طرف بڑھا کر اس اعتماد کے ساتھ چیخی جیسے وہ ننھی سی لڑکی سے ایک بڑی عمر عورت بن گئی ہو۔

"آپا بی صابرہ! یہ کام میں کروں گی، میں تمہارے بال دھوؤں گی۔ ان میں کنگھی کروں گی۔ تمہاری روٹی پکاؤں گی، اور تمہیں کھلاؤں گی۔ اور یہ کہتے وقت منور اور آپا صابرہ کو یہ ننھی سی زہرہ اپنی عمر کی حدیں پھاند کر ایک جوان عورت نظر آنے لگی تھی ان دونوں نے اسے لپٹا لیا۔

اور اندھی صابرہ نے بیٹھے ہی بیٹھے اس ننھے ننھے پاؤں پر اپنے دونوں ہاتھ رکھ دیئے
اور یہ بھی کتنی عجیب بات ہے کہ معصوم بچوں کے ماں باپ جب دم توڑ دیتے ہیں

تو بچوں کو اپنا ماضی یکلخت بھول جاتا ہے اور مستقبل کے ڈراؤنے اندھیرے ان کو اس درجہ ڈرا دیتے ہیں کہ مکروہ حال بھی ایک خوفناک دھندلکا بن جاتا ہے - اور وہ اس دھندلکے کی مکروہ چادر کو پھاڑ کر مستقبل کے دامن کو نوچنے لگتے ہیں - اور یہ چاروں بچے سرہانے بھول چکے تھے - اور انہیں یہ بھی یاد نہ رہا تھا کہ ان کے بالکل ساتھ ہی کہ بی اماں کی نعش بے گوروکفن پڑی ہے ۔

مگر بچپن کی وادیوں کے پر پیچ رستوں اور بڑی بڑی پگڈنڈیوں سے تیزی کے ساتھ گزر کر جوانی اور ادھیڑ عمر کی صاف اور سیدھی سڑکوں پر بھاگنے والے، ان وادیوں کو کیا سمجھیں - یہ تو کچھ وہی جان سکتے ہیں جو ابھی ان وادیوں میں پھنسے ہیں -

وہ چاروں ابھی تک ایک دوسرے کے سینہ سے لگے ، مستقبل کے ڈراؤنے خواب دیکھ رہے تھے کہ بی رحیمن نے اندر قدم رکھا اور یہ منظر دیکھ کر چیخ ہی تو اٹھی۔ اور بچے ، ایک دوسرے کو چھوڑ چھاڑ اس کی طرف لپکے ، بی رحیمن نے سائرہ کے گلے میں باہیں ڈال دیں - اور رونے لگی ۔

اور روتے روتے نہ جانے اسے کیا ہوا ، اس نے سائرہ کو چھوڑ دیا ، اور بی اماں کی چارپائی پر لپکی ، اور بی اماں کا نام لے لے کر رونے لگی ۔

اور جب خوب رو چکی - تو جیسے اسے کچھ یاد آیا جیسے بی اماں کی نعش نے اس سے کچھ کہہ دیا ہو وہ اپنی جگہ سے اٹھی ، باہر آئی ، اور پورے زور کے ساتھ پکارا "اے شاہ جی بابا" "اری رحمت ، اے نوراں ، اے بھیا امداد خاں" اے گلشن ، اور نہ جانے کس کس کے نام لے ڈالے اور یہ نام لے کر پھٹی پھٹی سی آواز کے ساتھ چیخی "ارے اس بستی پر کون موت کے دامن میں جا سوئی ہے ۔

اور یہ آواز بجلی کے تاروں سے بندھی فضا میں پھیلی اور بستی کے قریب گھروں کے دروازوں اور کھڑکیوں سے سر پھوڑتی، ان میں دبے بیٹھے مردوں اور عورتوں کے کانوں میں گھس گئی۔

دروازے کھلنے لگے اور عورتیں اور مرد اپنے اپنے گھروں کے سامنے پھیلے پانی کی جھیل کو عبور کر کے، اس طرف آنے لگے۔

اور دیکھتے ہی دیکھتے بہت سی عورتیں، بیوی جی کی نعش کے آس پاس آن کھڑی ہوئیں۔ اور باہر برآمدہ میں مرد آن بیٹھے۔ ان میں گاؤں کے بوڑھے ذیلدار ضمیر احمد بھی تھے اور ان کے جوان بیٹے، سرفراز بھی، اور شاہ جی بابا بھی تھے۔ اور ان شاہ جی بابا کی آنکھیں بُری طرح بہہ رہی تھیں اور زبان بیوی کی اچھی باتوں اور نیک خصلتوں کی کہانی کہہ رہی تھی۔

بوڑھا ذیلدار شاہ جی بابا کو بیوی صاحبہ کی تعریف کرتے سن کر نہ جانے کیوں آپ ہی آپ بول اُٹھا:۔

بھائیو! بی بی جی بڑی اچھی تھیں۔ نیکی اور پاکیزگی کی مورتی تھیں۔ اپنے شوہر سید نور شاہ کی موت کے بعد سے لے کر اب تک نیکی اور پاکیزگی کی محکم دیوار بنی رہیں۔ ہماری بستی پر ان کا بڑا حق ہے۔ ہماری ساری بستی کی لڑکیاں اور بچے ان سے فیض پاتے رہے ہیں۔ اس لئے ہم سب کو چاہئے۔ ہم ان کی اولاد کی دیکھ بھال کی ذمہ داری اپنے اوپر لے لیں۔ چھوٹی چھوٹی معصوم بچیاں پہلے باپ بن رہ گئی تھیں اور اب انہیں ان کی ماں بھی چھوڑ گئی ہیں۔

شاہ جی بابا نے بات کاٹ لی " آپ بڑے ہیں ہم سب کے، آپ ہمارے

ہم آپ کی پیروی کریں گے۔

بوڑھے ذیلدار نے سر گھما کر شاہ جی بابا کی طرف دیکھا اور شاہ جی بابا کی جہاندیدہ آنکھیں اسے کچھ کہہ رہی تھیں۔ اس نے ان آنکھوں کا پیغام سمجھ لیا تھا۔ اس لئے کسی قدر بارعب آواز میں کہنے لگا۔

" اچھی بات ہے۔ اس کی پہل میں کرتا ہوں، مرحوم نورشاہ کی زمین کے ساتھ میرے جتنے کھیت ہیں وہ آج سے ان بچیوں کے ہیں۔

شاہ جی بابا نے بات کاٹ لی مگر آپ کے یہ کھیت تو سرفراز کی ماں کے نام ہو چکے ہیں

ذیلدار نے شاہ جی بابا کی طرف دیکھے بغیر جواب دیا " میں سرفراز کی ماں کو اس کے بدلہ میں دوسری زمین دے دوں گا۔

سب لوگ زمیندار کی اس بات کی تعریف کرنے لگے۔ اور ذیلدار کا بوڑھا سر ذرا اور اُوپر کو اُٹھ گیا۔ اور اس اُوپر اُٹھے سر کو گھما کر ذیلدار نے شاہ جی بابا کی طرف ایک بار پھر دیکھا جیسے پوچھ رہا ہو " اور حضور شاہ صاحب آپ کیا کریں گے؟"

شاہ جی بابا ذیلدار کی نظروں کو پہچان گئے، بولے " میرے پاس کچھ زیادہ تو نہیں ہے۔ صرف ۳۲ بھیگے زمین ہے، میں یہ زمین ان بچیوں کے نام منتقل کر دوں گا اور اگر یہ اجازت دیں گی تو ان کی اس زمین کو خود بوؤں گا۔

اور بوڑھے ذیلدار کو یہ بات سن کر ایسا محسوس ہوا جیسے ان کے بچپن کا یہ ساتھی سلطان احمد آج بھی ان سے بازی لے گیا ہے۔ اور اپنی غربت کے باوجود ان کو شکست دے گیا ہے

ابھی ان میں اور کوئی بات نہیں ہوئی تھی کہ اندر سے ذیلدارنی کی آواز آئی

" جنازہ تیار ہے۔"

اور جب یہ جنازہ اُٹھایا گیا - تو سائرہ اور صابرہ کھڑی نہ رہ سکیں - بہت زور سے چیخیں اور جہاں کھڑی تھیں وہیں گر پڑیں -

ننھی زہرہ، پہلے صابرہ کی طرف بڑھی اور پھر سائرہ کی طرف آئی اور ان دونوں کے گلے میں باہیں ڈال کر رونی روتی آواز میں کہنے لگی:-

" آپا بی - اتنا نہ روؤ - ہم کو دیکھو ہم تم سے کتنی چھوٹی ہیں ، مگر اس بُری طرح ہم بھی نہیں روتیں -

اور بی رحیمن نے اس زہرہ کو سینہ سے لگالیا اور ذیلدارنی نے دونوں ہاتھ پھیلا کر ایک صابرہ کے اور ایک سائرہ کے سر پر رکھ دیا ، اور مری مری آواز میں دونوں کو تسلی دی:-

" بیٹی ، موت پر کسے زور ہے ،

اور تم تو بڑی صابر ماں کی بیٹیاں ہو ، اس کا تو بڑا جگرا تھا - وہ تو مردوں کا سا حوصلہ رکھتی تھی -

زہرہ کو جیسے کسی غیر مرئی قوت نے ماں کا یہ حوصلہ اچانک بخش دیا وہ بھی رحیمن کے بازوؤں میں لپٹی ہوئی چیخی :-

" چچی اماں ! ہم بھی ایسا ہی صبر کریں گی جیسے امی کرتی تھیں " - اور ذیلدارنی نے اس زہرہ کی طرف دیکھا ، اور اس زہرہ کی آنکھوں میں آئی ہوئی آنسوؤں کی بوندیاں وہیں رُک گئی تھیں - اس کے دل کے عزم نے شاید کوئی عجیب و غریب زنجیر پھینک کر ان آنسوؤں کو پیچھے کی طرف کھینچ لیا تھا -

بوڑھی ذیلدارنی نے دونوں ہاتھ بڑھا کر اس زہرہ کو اپنی طرف کھینچ لیا ، اور اس کا سر اور مُنہ چومنے لگی -

اور منور جنازہ کے ساتھ نہیں گیا تھا، وہیں دروازہ سے لگا رکا کھڑا تھا۔ اور اس کی روتی آنکھیں اندھی صابرہ پر جمی تھیں اور اس کا جی کس بُری طرح چاہ رہا تھا کہ آگے بڑھ کر اپنے دونوں ہاتھ اس کے گلے میں ڈال دیئے اور چیخ چیخ کر کہے:۔

"اے صابرہ تیری آنکھیں میں بنوں گا، تو ہر چیز کو میری بینائی سے دیکھے گی۔

" مگر وہ اس ذیلدار سے بہت ڈرتا تھا۔ اور پھر کتنی ساری بوڑھی عورتیں چاروں طرف کھڑی تھیں۔ اسے اپنے ارادہ کو عملی جامہ پہنانے کی ہمت نہ ہوئی اور جنازہ باہر کے برآمدہ سے اٹھ کر انسانی کندھوں کا سہارا لے کر قبرستان کی طرف بڑھنے لگا۔

اور ذیلدار اور سلطان احمد شاہ کی درود پڑھتی وزنی آواز ایک عجیب کھڑکھڑاہٹ کے ساتھ، منور کے کانوں سے ٹکرا ٹکرا کر اس کے سینہ میں رکھے دل سے کہہ رہی تھی تو بھی جب بڑا ہو گا تو، تو بھی بستی کے جنازوں کو کندھا دیتے وقت اسی طرح کی اونچی آواز میں درود پڑھ سکے گا اور نہ جانے کیسے ایک عجیب خیال اس کے اس ننھے سے دل میں آن ٹپکا۔ اور جب صابرہ مرے گی تو میرے مضبوط کندھے اس کے جنازہ کو اٹھائیں گے۔ اور یہ خیال نہ تھا ایک دہکتا ہوا انگارہ تھا، جو اس کے دل پر زمانہ نے اچانک پھینک دیا تھا۔ اور اس کا دل بُری طرح جلنے لگا۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھ سینہ پر رکھ لئے۔ آنکھیں بند کر لیں۔

مگر دل ابھی تک جل رہا تھا۔

تیسرا باب

بی اماں کی موت کے بعد یہ آج پہلی رات تھی جو اپنا خوفناک مُنہ کھولے سرِ شام ہی ان تینوں بدنصیب بہنوں کی طرف لپکی آ رہی تھی - وہ ابھی تک رو رہی تھیں۔ اور روتے روتے کبھی کبھی متواتر تین راتوں سے جاگتی رہنے والی آنکھیں آپ ہی آپ بند ہوجاتیں - اور سر اونگھنے لگتے -

ذیلدارنی اور بہت سی دُوسری بیبیاں اپنے اپنے گھروں کو جا چکی تھیں - آخر ان کے گھریلو کام رُکے پڑے تھے - ان کا جانا ناگزیر تھا - البتہ بی رحیمن ، اس کی دونوں بیٹیاں رالبعہ اور مریم ، تینوں ابھی یہیں تھیں - اور منور میاں تو صابرہ سے چند قدم کے فاصلہ پر اس طرح دھرنا دیئے بیٹھے تھے جیسے وہ اللہ میاں سے رُوٹھ گئے ہوں - مریم بڑی تھی وہ سائرہ کی ہم عمر اور ہمجولی تھی اس لئے سائرہ کے قریب بھی تھی - اور رالبعہ منوّر اور صابرہ جتنی تھی وہ منوّر اور رالبعہ کی ہم جولی تھی - اس لئے وہ بھی ان دونوں سے چند قدموں کے فاصلہ پر اس طرح کھڑی تھی جیسے ان دونوں کا غم اس کا اپنا غم ہے - یُوں بھی منوّر کا غم تو ہمیشہ اس کا اپنا غم ہوا کرتا - اور جب کبھی منوّر اور صابرہ بچپن کے الھڑپنے کے باعث ایک دوسرے سے لڑ پڑا کرتے - اور صابرہ غصّہ میں آن کر اندھا دھند غریب

منور پر، اس کی کتابیں دے پھینکتیں۔

اور منور کی آنکھیں بہہ نکلتیں، تو رابعہ اس کے گلے میں اپنی باہیں ڈال دیتی اور صابرہ کو بہت غصہ کے ساتھ ڈانٹتی۔

"تم تو اندھی ہونا، تمہیں تو دکھتا نہیں ہے۔ مگر ہمیں تو دوسروں کی روتی آنکھیں نظر آتی ہیں۔"

اور صابرہ اپنے کئے پر پشیمان ہو جاتی اور دونوں ہاتھ پھیلا کر منور کو منا لیتی اور منور اس طرح ہنسنے لگتا جیسے صابرہ نے اس کے ساتھ کوئی زیادتی کبھی کی ہی نہیں۔ اور رابعہ سوچنے لگتی

"یہ پگلا منور بھی عجیب بے شرم مٹی سے بنا ہے۔"

اور اس بے شرم مٹی سے بنے ہوئے، منور کی حالت پر اس پاس کھڑی رابعہ کو بہت ترس آرہا تھا۔ اس پگلے نے آج اپنی حالت کیا بنا رکھی تھی۔ اس کے سنہرے سنہرے گھنگھریالے بال کس بے ترتیبی سے بکھرے پڑے تھے۔ سارے کپڑے مٹی سے اٹ گئے تھے۔ شلوار کے پائنچوں پر تو کیچڑ کی کئی تہیں جمی تھیں۔ اس کا اور گرم کوٹ تو ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اس منور نے اسے گیلی مٹی میں کئی بار روند روند کر پھر پہنا ہو۔ رابعہ کا جی چاہا آگے بڑھ کر اس پگلے منور کے بالوں کو سنوار دے۔ مگر وہ اپنی اس آپا مریم سے بہت ڈرتی تھی اس کے سامنے اسے اپنے دل کی خواہش کو پورا کرنے کی ہمت نہ ہوئی۔

بوڑھی رحیمن نے بیوی جی کا بستر اور دوسرے کپڑے جنہیں تھوڑی دیر پہلے اس نے دھوپ میں ڈالا تھا، اٹھا اٹھا کر اندر لا رہی تھی کہ شاہ جی بابا نے صحن میں سے کھڑے کھڑے پکارا۔

بی رحیمن ان سے پردہ کرتی تھی اس لئے دروازہ کے قریب آن کر پوچھا "کیوں شاہ جی کیا حکم ہے ؟"

شاہ جی بولے "کھانا لایا ہوں بچوں کے لئے ۔"

بی رحیمن کے منہ سے بے ساختہ "ارے" نکل گیا ۔ اس نے حیرت سے دانتوں میں انگلی داب لی ۔ یہ حیرت کی بات ہی تھی ، شاہ جی کے گھر میں کوئی عورت نہ تھی ۔ صرف وہ اور منور بہادر تھے ۔ بی رحیمن نے سوچا ، شاہ جی اتنا کھانا کیسے پکا کر لائے ۔ اس لئے کہنے لگی "شاہ جی آپ نے یہ تکلیف کیوں کی ۔ میں جو یہاں تھی ۔ آپ پکا لیتی ۔ اور پھر ذیلدارنی کہہ گئی تھیں آج کھانا وہ بھیجے گی ۔"

شاہ جی نے جواب دیا " یہ آپ ٹھیک فرماتی ہیں ۔ مگر میں نے ان بچیوں کی خدمت آج سے اپنے ذمہ لے لی ہے ۔ اور میں نہیں چاہتا تھا کہ فاطمہ بہن کی بیٹیاں کسی دوسرے کے ہاتھ کی روٹی کھائیں ۔"

اور رحیمن اس شاہ جی کی غیرت سے واقف تھی ۔ شاہ جی کسی کے ہاں کا کھانا تو بڑی چیز ہے کسی کے ہاں سے آگ تک مانگنے کو خودداری اور شرافت کے خلاف سمجھتے تھے ۔ اور اسی لئے سارا گاؤں ان کی عزت کرتا اور ان سے دبتا تھا ۔ اور یہی سبب تھا آج ذیلدار نے ان کے رعب میں آن کر بیس بیگھے زمین ان بچوں کے نام کردی تھی ، اور شاہ جی ابھی ابھی زمین کا کاغذ ان سے لے کر آئے تھے ۔ اور روٹی کے ساتھ ساتھ یہ کاغذ انہوں نے بی رحیمن کے پھیلے ہوئے ہاتھ پر رکھ دیا اور جب بی رحیمن نے پوچھا " شاہ جی یہ کاغذ کیسا ہے ؟" تو انہوں نے بڑے فخر کے ساتھ کہا " یہ بچیوں کی زمین کا کاغذ ہے ۔ سائرہ سے کہئے اسے صندوق میں بند کرلے ۔"

اور غریب سائرہ تو نیم مدہوشی کی حالت میں پڑی تھی ، وہ اس کاغذ کو کہاں بند کرتی بی رحیمن نے یہ فرض بھی خود ہی انجام دیا ۔ اور کاغذ کو احتیاط کے ساتھ صندوق میں رکھ کر ان بچّوں کو سنبھالا ، اور محبت بھری آواز میں کہنے لگی :-

" بیٹو ! دو دو لقمے مُنہ میں ڈال لو ، نہ جانے کتنی راتوں سے کچھ کھایا نہیں تم بے چاریوں نے ۔"

مگر یہاں بھوک کسے تھی ۔ ساری بھوک اور اس کا احساس تو ان کی ماں مرتے وقت اپنے ساتھ لے گئی تھی اور اب تو ان کے پاس غم ہی غم تھا ۔ البتہ بی رحیمن کی یہ بات سن کر ننھی زہرہ نے اپنے بوجھل سر کو بہت زور کا جھٹکا دیا ۔ جیسے وہ اپنے حواس کو درست کر رہی ہو ۔ اور جیسے ہی اس کے حواس درست ہو گئے ۔ اس نے سامنے بچھے دسترخوان پر سے چاولوں کی پلیٹ اُٹھالی اور اسے لے کر صابرہ کے قریب آن بیٹھی اور اس طرح جیسے کوئی مہربان ماں اپنے بیمار بچے کے مُنہ میں لقمے ڈال رہی ہو ۔ اس نے صابرہ کے مُنہ میں لقمے ڈالنے شروع کئے ۔ صابرہ نے بہتیرا منہ بنایا ۔ مگر زہرہ نہ مانی اور اس کے مُنہ میں زبردستی لقمے ڈالتی گئی ۔ رابعہ منوّر بہادر کو پکڑ لائی ۔ اور مریم نے سائرہ کو سنبھالا ۔ سائرہ نے تو ایک لقمہ کھا کر ہی تھوک دیا ۔ البتہ منور بُری طرح قابو آیا تھا ۔ رابعہ نے اس کا ایک بازو بُری طرح اپنی مٹھی میں بھینچ رکھا تھا اور دوسرے ہاتھ سے لقمے اس کے مُنہ میں ڈال رہی تھی ۔

صابرہ کو کچھ معلوم نہ تھا کہ منوّر کے ساتھ کیا ہو رہا ہے ۔ اگر اس کے پاس آنکھیں ہوتیں تو شاید رابعہ والی خدمت وہ خود انجام دیتی ۔ مگر بد نصیب آنکھیں نہ رکھتی تھی ۔

شاہ جی باہر برآمدہ میں بچھی ٹوٹی چارپائی پر بیٹھ گئے تھے ۔ اور غلام محمد چوکیدار ان کے سامنے حقہ رکھے کبھی حقہ کی نے اپنی طرف اور کبھی شاہ جی کی طرف پھیرا رہا تھا ۔ کہ

شاہ جی کے سینہ پر رکھے بوڑھے دل میں آج سارے دن میں پہلی بار محبت پدری کی آگ روشن ہوئی اور انہوں نے زور سے اندر آواز دی ۔

"کیوں بیٹی رالعہ، منوّر نے بھی کچھ کھایا ہے ؟"

اور بی رالعہ نے بڑے فخر کے ساتھ جواب دیا :-

" شاہ جی ! میں اسے ایک بازو سے پکڑے زبردستی اس کے مُنہ میں لقمے ڈال رہی ہوں"

اور اب اس اندھی صابرہ کو علم ہوا کہ اس کے سم جولی منوّر کو یہ رالعہ بیٹھی کھانا کھلا رہی ہے۔ اور نہ جانے اچانک اس کا سارا غم کیسے بادل بن کر اڑ گیا کہ اس کا جی چاہا وہ آپ اپنے ہاتھوں کے ساتھ منوّر کو کھانا کھلائے ۔ وہ اس سے پہلے کتنی بار اپنے ہاتھوں سے اسے کھانا کھلا چکی تھی ۔ مگر اس اندھی کی تو آنکھیں ہی نہ تھیں اور اب تو ہاتھوں میں بھی طاقت نہ تھی ۔

رات منہ پھاڑے ہوئے مسلّط ہوتی جا رہی تھی ۔ شاہ جی اور غلام محمد چوکیدار باہر کے برآمدہ میں، بچھی ہوئی چارپائیوں پر کئی کئی رضائیاں اوڑھے لیٹ گئے تھے ۔

اور اندر بی رحیمن نے سارے بچّوں کو فرش ہی پر لیٹا کر دیئے تھے ۔ اور تینوں روتی بہنیں کئی رات کی مسلسل بے خودی کے بعد اس بری طرح سوئی پڑی تھیں جیسے ان کے دلوں کا غم بھی ان کے ساتھ ہی سو گیا ہو ۔

البتہ رالعہ، مریم اور منوّر کچھ ایسے بیہوش نہ ہوئے تھے ۔ مریم تو کبھی کبھی آنکھیں کھول کر سائرہ کو دیکھ بھی لیتی ۔ اور اگر اس کے ہاتھ رضائی سے باہر نکل جاتے تو انہیں بڑی نفاست سے اندر کر دیتی ۔

اور یہی سلوک منوّر بہادر صابرہ اور زہرہ کے ساتھ کر رہے تھے ۔ اور یہ عجیب

اتفاق ہوتا کہ جب کبھی منور بہادر صابرہ اور زہرہ کے بے قابو ہاتھوں کو رضائیوں تلے چھپا رہے ہوتے ۔ رالعہ کے پھیلے ہوئے بازو نہ صرف منور کی رضائی بلکہ اپنی رضائی بھی اس پر ڈال دیتے ۔ اور وہ خود اس کے ساتھ اس طرح لگ جاتی جیسے منور کو کوئی چرا کر لیجا رہا ہو۔

چوتھا باب

اور صبح سب سے پہلے ہی رالعہ سو کر اُٹھی ، بی رحمین اور مریم دونوں نماز پڑھنے میں مصروف تھیں اور بے پگلی رالعہ منوّر کی سُنہری زلفوں سے کھیل رہی تھی - اور نہ جانے کیسے جب سوتے میں صابرہ کے بازو پھیل کر منوّر کے بازوؤں کے قریب آجاتے تو رالعہ انہیں بڑے غصّہ کے ساتھ پرے ہٹا دیتی -

اور یہ عمل اس وقت تک جاری رہا جب تک کہ کھلی کھڑکی میں سے دُور افق پر بلند ہوتے ہوئے سُورج کی سُنہری شعاعیں اندر نہ آنے لگیں -

وہ سب اُٹھ بیٹھیں - اور ایک دوسرے کی طرف دیکھا - اور ان سب کو ایسا محسوس ہوا جیسے ان کے چہروں پر چھائی زردی کچھ کم ہو گئی ہے -

وہ تینوں خوب جی بھر کر سوئی تھیں - اور ان کے دل کچھ ہلکے ہلکے سے تھے -

اور زہرہ کا دِل تو بہت ہی ہلکا تھا - اس نے اُٹھتے ہی ، صابرہ کے کپڑے درست کیے - اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے غسل خانہ لے گئی - مُنہ ہاتھ دُھلایا - اسے کہا یہیں ٹھہری رہو اور بھاگ کر اندر آئی ، اس کے دُھلے ہُوئے کپڑے لے گئی - اور یہ دُھلے ہُوئے کپڑے پہنا کر واپس لائی اور منوّر کو صاف صاف کپڑے پہنے ہوئے یہ صابرہ کچھ بُہت ہی عجیب معلوم

ہوئی۔ اور اس نے اپنے دونوں میلے میلے ہاتھ ، اس کے کندھوں پر رکھ دیئے۔ زہرہ نے شوخی سے اس کے یہ ہاتھ پرے ہٹا کے کہنے لگی۔

" تمہارے ہاتھ گندے ہیں تم آپا بی کے دُھلے ہوئے کپڑے خراب کر دو گے۔ دیکھو کیسے کیچڑ لگی ہے ، تمہاری آستینوں پر۔"

اور منور شرما گیا ، اور یہ شرمانا منور رابعہ کو بڑا بھلا معلوم ہوا۔ اس نے اس کے دونوں ہاتھ پکڑ لئے اور اسے گھسیٹتے ہوئے باہر لے گئی اور پوری شوخی کے ساتھ شاہ جی سے کہنے لگی :۔

" آپ نے دیکھا شاہ جی بابا اس کے کپڑوں کی کیا حالت ہے ؟"

شاہ جی ہنس دیئے اور منور کو حکم دیا ، گھر سے کپڑے بدل کر آئے۔ منور کا گھر یہاں سے زیادہ سے زیادہ سو قدم کے فاصلے پر تھا۔ مگر یہ فاصلہ آج اچانک اس منور مہاراج کو سو کوس معلوم ہونے لگا۔ وہ بھاگا بھی۔ مگر یہ فاصلہ تو ختم ہونے میں نہیں آتا تھا۔ اور اس کا معصوم دِل آج اپنی اس اچانک تبدیلی پر بڑا حیران تھا۔ گھر آ گیا سو کوس معلوم ہونے والی مسافت ختم ہو گئی۔ منورّ اندر کو لپکا۔ غلام محمد چوکیدار صحن میں بیٹھا تھا۔ جب یہ بھوت بنا منورّ اندر پہنچا وہ اسے دیکھ کر بری طرح ہنس دیا۔ اور چھوٹے شاہ جی بری طرح شرماتے شرماتے اندر داخل ہوئے۔

اس ہندوستان میں غریبی کا عیب لے کر پیدا ہونے والے کسانوں کے بچوں کے پاس اتنے کپڑے نہیں ہوتے کہ وہ وقت بے وقت انہیں تبدیل کر سکیں۔ منورّ بھی ایک معمولی کسان کا بیٹا تھا۔ جس کے پاس صرف ۳۳ بیگھے زمین تھی۔ اور ان ۳۳ بیگھوں کی آدھی پیداوار تو سرکار کی نذر ہو جاتی ۔ اور جو باقی بچتی ، اس میں سے دو حصے شاہ جی چپ چاپ سائرہ ، صابرہ اور زہرہ کی ماں کے ہاں دے آتے۔ اور باقی کی پیداوار میں وہ اپنا ،

اپنے بیٹے اور غلام محمد چوکیدار کا پیٹ پالنے۔ لباس ان کا اپنا بھی کھادی کا ہوتا اور منوّر میاں کے لئے بھی ہر سال چار جوڑے کھادی کے سِل جاتے۔ اسے تیسرے چوتھے سال ایک گرم کوٹ بھی مل جاتا۔ اور منوّر اس وقت جو گرم کوٹ پہنے تھا۔ وہ اسی سال سِلا تھا۔ اور اس کے پاس اس کے سوا اور کوئی کوٹ نہ تھا۔ اس نے یہ کوٹ تو اتار دیا۔ کھادی کا کرتہ" اور پاجامہ بھی پہن لیا۔ مگر سردی تو ابھی اس کے نازک جسم کو بُری طرح کھائے جارہی تھی اس نے بڑی بےقراری کے ساتھ اِدھر اُدھر دیکھا۔ اس کے باوا کی بڑی سی چادر چارپائی پر پڑی تھی۔ اسے جلدی جلدی لپیٹا اور باہر کی طرف بھاگ نکلا۔ غلام محمد چوکیدار ایک دفعہ پھر اسے دیکھ کر ہنسا مگر منور نے اس کی ہنسی کی کوئی پروا نہ کی۔ اور بھاگتا بھاگتا باہر نکل آیا۔

وہ سڑک پر بھاگ رہا تھا اور جب وہ صابرہ کے صحن میں پہنچ کر رُکا۔ نور رالعہ اور مریم اسے دیکھ کر بُری طرح ہنسنے لگیں۔ وہ ساری کی ساری دھوپ تاپنے صحن میں آن بیٹھی تھیں۔ منوّر کی سمجھ میں کوئی بات نہ آئی کہ یہ رالعہ اور مریم اس پر کیوں ہنس رہی ہیں مگر وہ ہنس رہی تھیں اور وہ غریب شرما رہا تھا۔ اور شریر رالعہ تو دو قدم بڑھ کر اس کے پاس آن کھڑی ہوئی تھی۔ اور کھادی کی چادر کا دامن کھینچتی ہوئی کہہ رہی تھی۔

کسی نے ہماری دلھن دیکھنی ہو تو دیکھ لے۔ اور بِگلا منوّر اس طرح شرمانے لگا تھا جیسے وہ سچ مچ کی دُلہن ہے۔ اور اس لمبی سڑک نے جیسے وہ پھلانگ کر آیا ہے اسے لڑکے سے لڑکی بنا دیا ہے۔

صابرہ اور سائرہ دونوں اپنی جگہ سے اُٹھ بیٹھیں۔ اور نہ جانے پگلی صابرہ کا جی اچانک یہ کیوں چاہنے لگا کہ وہ منور کو دلہن بنا دیکھ لے۔ مگر دل کے چاہنے ہی سے تو سارے غم پیدا ہوتے ہیں۔ اگر ہمارے دل فضول فضول اور ناممکن سی باتیں نہ چاہا کریں

تو کوئی غم پیدا ہی نہ ہو۔ مگر ہم چاہتے ہیں اور بڑی سے بڑی ناممکن بات کو چاہنے لگتے ہیں۔ صابرہ بھی یہ ناممکن بات چاہ رہی تھی اور جب یہ بات پوری نہ ہوئی تو اس کا دل کانپ اٹھا، اور یہ نامکمل خواہش غم بن کر اس کی آنکھوں کی طرف دوڑی اور کئی موٹے موٹے آنسو اس کے گالوں پر بہہ نکلے۔

منور کی نگاہیں صابرہ کے چہرہ پر جمی تھیں اس نے صابرہ کو روتے دیکھا تو چادر جسم پر سے اتار کر پرے پھینک دی اور اپنی جگہ سے اچھل کر صابرہ کی طرف اس طرح بڑھا، جیسے اس کی چادر میں بچھو تھے اور انہوں نے اسے کاٹ کھایا تھا۔

اور بی رابعہ تو جل بھن گئی۔ اور منہ لسبور کر باہر کی طرف بھاگ نکلی۔

مریم اور سائرہ جانتی تھیں کہ رابعہ منور اور صابرہ کے میل جول سے جلتی ہے۔ مگر انہیں آج سے پہلے یہ بات معلوم نہ تھی کہ اس جلن کی تہہ کتنی گہری ہے۔ اور آج ان دونوں نے یہ تہہ پالی اور ایک دوسری کے ہاتھ میں ہاتھ دے کر نہ جانے کیا کیا کچھ سوچنے لگیں۔

اور صابرہ منور کے ہاتھوں پر اپنی گداز گداز انگلیاں پھیر پھیر کر اس سے پوچھنے لگی تھی۔

یہ رابعہ تمہیں دلہن کیوں کہہ رہی تھی۔ اور منور پوپلے منہ سے جواب دے رہا تھا:۔

ہمیں سردی لگ رہی تھی ہم نے ابا میاں کی بڑی سی چادر اوڑھ لی تھی۔

صابرہ نے پھر پوچھا " کیا تم اس چادر میں لپٹے ہوئے سچ مچ دلہن معلوم ہو رہے تھے؟ ہائے کاش میں بھی دیکھ سکتی۔

کتنی سادگی اور کتنی یاس تھی اس سوال میں۔ سائرہ کے ہاتھ سے مریم کا ہاتھ آپ ہی آپ چھوٹ گیا۔ اور اس غریب کی آنکھیں بہن کی اس بے چارگی پر بری طرح بہہ نکلیں۔

اور زہرہ تو بہن سے لپٹ لپٹ گئی۔ اور نہ جانے کیسے آپ ہی آپ کہنے لگی:۔
"منجھلی آپا بی! دیکھو تم ایسی باتیں اب نہ کیا کرو۔ ہم نے تم سے کہہ تو دیا۔ ہماری آنکھیں تمہاری آنکھیں ہیں۔ تم ان سے دیکھا کرو۔ ہم سے قسم لے لو۔ جس چیز کو تم دیکھنا چاہو گی ہم اس کو دیکھ کر باقی ہر چیز سے آنکھ بند کرلیں گے" اور بی صابرہ نے اپنی اس بہن کی پیشانی چوم لی۔

اور پاس کھڑے منوّر کا نہ جانے کیوں یہ جی چاہا کہ یہی بات وہ کہتا اور صابرہ اس کی پیشانی چوم لیتی۔ اور آہ یہ کتنا اچھا ہوتا۔ منور نے یہ بات سوچ تو لی مگر یہ کتنی بے ہودہ سی بات تھی منور اپنی اس خیالی بے ہودگی پر شرما سا گیا اور سائرہ کو ایسا معلوم ہوا جیسے منور پہلے سے کچھ بدل گیا ہے۔

پانچواں باب

اور یہ منور پہلے سے بہت بدل گیا تھا۔ یوں تو اس کی عمر پندرہ سال کی تھی۔ مگر وہ خود کو جوان اور ذمہ دار مرد محسوس کرنے لگا تھا۔ ایسا مرد جو ایک نہیں کئی کمزور عورتوں کا بوجھ اپنے کندھوں پر اٹھا سکے۔ یہ احساس اور شعور ہی تو ہے۔ جو بچپن، جوانی اور بڑھاپے کی سرحدوں کا نشان ہے۔ بچپن میں ذہنی قوی چونکہ پوری طرح بیدار نہیں ہوتے اس لئے احساس اور شعور بھی بچپن کے جھولے میں جھولتا رہتا ہے۔ مگر منور کا احساس بچپن کے اس جھولے سے اکتا کر ذمہ داریوں کی پگڈنڈیوں پر دوڑنے لگا تھا۔ اور یہ احساس تو اسی رات جاگ اٹھا تھا جب پچھلے ہفتہ بی بی جی نے اس کے شاہ بابا کے دروازہ کی اوٹ میں کھڑے ہو کر کہا تھا:۔

"بھیا! مجھے اپنے پیچھے کسی اور کی فکر نہیں صابرہ کی فکر ہے۔ وہ اندھی ہے نا۔" اور شاہ بابا نے بہت دھیرے آواز میں جواب دیا تھا:۔

"میرا منور تیری صابرہ کا ہاتھ پکڑے گا اور اس کی بینائی بن جائے گا۔"

اور اب تو وہ وقت آگیا تھا۔ اس نے پڑھائی چھوڑ دی تھی اور باپ کے ساتھ ہل جوتنے لگا تھا۔ وہ باپ کے ساتھ ہی منہ اندھیرے چارپائی پر سے اٹھتا۔ بیلوں کی جوڑی ہانکتا۔

اور ان کھیتوں پر آن پہنچتا جو سائرہ صابرہ اور زہرہ کی ملکیت تھے۔ ان کھیتوں کی منڈیروں پر کھڑے ہو کر نہ جانے وہ اپنی ایڑیاں کیوں اوپر کی طرف اُٹھا لیتا۔ شاید اسے یاد آجاتا کہ وہ ابھی پندرہ سال کا ہے۔ اپنے اس احساس کو مٹانے کے لئے وہ ایڑیاں اُٹھا اُٹھا کر ان کھیتوں کی طرف دیکھتا جن میں اس نے ہل چلایا تھا۔ اور اس کا جی چاہتا مٹی کے ان ڈھیلوں کو اُٹھا اُٹھا کر نمائش گاہِ عالم میں لے جائے۔ اور لوگوں سے چیخ چیخ کر کہے:۔

"میں اب جوان ہوں۔ پندرہ برس کی عمر میں جوان اور اسے بڑھاپے، جوانی اور بچپن کو عمر کے پیمانہ سے ناپنے والو میں نے تمہارا یہ پیمانہ توڑ دیا ہے۔" اور جیسے ہی اسے یہ خیال آتا، نہ جانے کیسے صابرہ، اندھی اور بے بصیرت صابرہ، اس کے تخیل کے دوش پر اُڑتی۔ اس کے دل میں آن بیٹھتی اور وہ سوچتا، کتنی رعنائی ہے اس کی اس صابرہ میں۔ اس کی آنکھیں گو نور سے محروم ہیں۔ مگر ان محروم نور آنکھوں میں کتنا حسن ہے اور اچانک اسے اس دن کی بات یاد آجاتی جب صابرہ، رالعبہ اور سائرہ تینوں ایک ساتھ جھولا جھول رہی تھیں۔ اور منور ان سب کے جھولوں کو ہوا میں لرزتے رکھنے کے لئے کتنا بے چین تھا اور یہ بے چینی تو اسی وقت بڑھ گئی تھی جب اس نے سائرہ کے جھولے کو ہوا میں لہرانے کے بعد صابرہ کے جھولے پر ہاتھ رکھا تھا۔ نہ جانے صابرہ نے کیوں اس کے دونوں ہاتھوں کو پکڑ لیا تھا۔ اور منور کو ایسا محسوس ہوا تھا جیسے وہ کانپنے لگا ہے۔ یہ کپکپاہٹ بالکل نئی تھی۔ اور اس کپکپاہٹ نے اس کی آنکھوں کو عجیب چمک بخش دی تھی۔ اور اس چمک کو دیکھ کر رالعبہ جھولا جھولتے جھولتے رک گئی تھی۔ اور بھاگ کر اس بے وقوف منور کی پیشانی چوم لی تھی اور اس کے جسم کے سارے رونگٹے کھڑے ہو گئے تھے۔ اس نے رالعبہ کو پرے دھکیل دیا تھا ۔۔۔، کاجی چاہ رہا تھا وہ رالعبہ کو اتنا مارے کہ رالعبہ چیخ اُٹھے، اس ظالم نے کتنی بُری حرکت

کی تھی ۔ اس نے اس سے وہ مسرت چھین لی تھی جو صابرہ نے اس کے ہاتھوں کو اچانک چھو کر اسے بخشی تھی اور یہ کیا کم جرم تھا، یہ کیا کم بے ہودگی تھی رالعہ کی ۔ اور اس جرم، اور بے ہودگی کا وزن اس لئے بھی بڑھ گیا تھا کہ رالعہ نے اس سے جو مسرت چھینی تھی وہ بالکل نئی تھی ۔ آج پہلی دفعہ محسوس ہوئی تھی ۔

رالعہ نے اس کی اس حرکت پر منہ تو بہت بنایا مگر نہ جانے وہ کس مٹی کی بنی تھی، کہ وہ اس سے پھر آن چمٹی اور اس بار اس کی پیشانی ہی نہیں اس کی آنکھیں تک چوم لیں ۔ اور منور اتنا گھبرایا کہ رونے لگا اور سائرہ چیخی ۔

" اری پگلی اب یہ منور صاحب اپنے آپ کو جوان سمجھنے لگے ہیں ۔ اب وہ کہتے ہیں وہ بچے نہیں رہے ۔"

اور منور کا جی چاہا، آپا سائرہ کی لمبی لمبی صراحی دار گردن میں اپنے ناخن چبھو دے اور پھر پوچھے کیوں ری آپا بی سائرہ یہ بچے کے ہاتھ ہیں یا جوان کے ؟ مگر وہ ایسا کر آپا بی سائرہ اس کے دل کی رانی صابرہ کی آپا تھی ۔ اور اب تو اس نے بھی اسے آپا بنا لیا تھا ۔ سب ایک ہو گئے تھے ۔ ایک ہی جگہ کھاتے ایک ہی جگہ اٹھتے بیٹھتے اور ایک ہی جگہ سوتے اس کے ابا میاں بھی یہیں آ گئے تھے ۔ اکیلی لڑکیوں کو رات کے وقت تنہا چھوڑنا ان کی غیرت کے منافی تھا ۔

اور آج ابھی سورج ڈھلا نہیں تھا ۔ اور وہ درخت کے سایہ تلے بیٹھے بیٹھے یہی سوچ رہا تھا کہ دور سے ننھی زہرہ معصومیت کے گیت گاتی، سر پر روٹی رکھے ادھر کی طرف لپکتی نظر آئی ۔ منور اٹھ بیٹھا اس نے اپنی ایڑیاں اٹھا لیں اور اس زہرہ کو دیکھا جو اپنے جوان اور محنتی بھیا کے لئے روٹی لے کر کھیتوں میں آ رہی تھی ۔ نہ جانے کیسے اس کی نظر زہرہ کے

چہرہ سے ہٹ کر دوسرے کھیتوں کی منڈیروں پر جا پہنچی ۔ کتنی جوان لڑکیاں سروں پر
روٹیاں رکھے سالوں میں بیٹھے جوان کسانوں کی طرف لپکی جا رہی تھیں۔ ان سب جوانوں نے
اسی کی طرح ہل کھول دیئے تھے اور سالوں میں آن بیٹھے تھے ۔ کہ ذرا سستا لیں۔ یہ کوئی
ایسی خاص بات نہ تھی ۔ ہر روز اور ہر جگہ ہر دوپہر کے وقت یہی ہوتا ہے ۔ بہادر کسانوں
کی تاریخ جب سے شروع ہوئی ہے ۔ ایسا ہی ہوتا آیا ہے ۔ مگر منور کو ایسا معلوم ہو رہا تھا
جیسے اس کے لئے یہ بالکل نئی بات ہے ۔ اور اس نئی بات میں اس کے دل نے ذرا سی تمنا
کرنی چاہی اور اس کے اندر خواہش پیدا ہوئی :۔

" اے کاش ، اس کی صابرہ ، اس کے لئے دوسری جوان لڑکیوں کی طرح سر
روٹی رکھ کر اس کی طرف آتی ۔" مگر ـــ صابرہ تو اندھی تھی ۔ وہ تو خود محتاج تھی
دوسروں کی ، وہ یہ خدمت کیسے انجام دے سکتی تھی ۔ منور کا دل اس تصور پر پہنچ کر
کانپ اٹھا ۔ اور ابھی یہ کپکپاہٹ دور نہ ہوئی تھی کہ زہرہ مسکراتی ہوئی آن پہنچی ۔ اور آ
منور کو منہ لبسورے ہوئے کھڑے دیکھ کر چیخی :۔

" منور بھیا ! یہ تم نے آج ہمیں مسکرا کر کیوں نہیں دیکھا "

اور منور مسکرا پڑا اسے اس زہرہ سے کتنی محبت تھی ۔ یہ ننھی زہرہ اس کے کتنے
کرتی ۔ اور نہ صرف اس کے کام کرتی بلکہ اس کی صابرہ کو کتنا آرام پہنچاتی ۔ اس کے بال گوندھتی
کنگھی کرتی اسے اٹھاتی ، اسے بٹھاتی ، یہ زہرہ ، صابرہ اور منور کے لئے سچ مچ کی ننھی
بن گئی تھی ۔ اور اگر وہ نہ ہوتی تو نہ جانے صابرہ کا کیا ہوتا ۔ سائرہ یوں تو بڑی اچھی تھی
بہت سست تھی ۔ بیمار بھی رہتی اس لئے کوئی کام نہ کر سکتی ۔ وہ تو صرف ایک ہی کام کرتی
مریم اور رابعہ کے ساتھ بیٹھ کر یا تو گیت گاتی یا گڑیاں کھیلتی ، اور یا جھولا جھولتی

زہرہ نہ ہوتی تو نہ جانے ان سب کا کیا حال ہوتا۔ اور منور نے اس چھوٹی ماں کو بجلی کی سی تیزی سے آگے بڑھ کر گود میں اُٹھا لیا۔ اور وہ بُری طرح ہنسنے لگی۔

اور جب دونوں درخت کے سایہ تلے بیٹھ گئے اور زہرہ نے کھانے کی چیزیں سامنے پھیلا دیں تو ایک تین کونی اور جگہ جگہ سے جلی ہوئی روٹی ساری روٹیوں سے الگ کر کے منور سے ہنس ہنس کر کہنے لگی:۔

" یہ روٹی تمہاری بی صابرہ نے بنائی ہے اور آپا بی سائرہ نے یہ روٹی بہت سنبھال کر رکھ لی تھی اور جب میں آنے لگی تو یہ روٹی مجھے دے دی اور حکم دیا۔ کہ تم کو دے دوں"

اور منور نے بے ساختہ یہ روٹی اس کے ہاتھ سے لے لی۔ اور اسے چومنے لگا۔ اور پگلا ایسا کرتے وقت یہ بھول ہی گیا کہ زہرہ یہ ساری بات ہر ایک سے جا کہے گی۔

اور اس شریر زہرہ نے اسی دوپہر واپس آکر پہلے تو یہ بات صابرہ سے کہی۔ اور صابرہ کو یہ بات سن کر ایسا محسوس ہوا جیسے ساری دُنیا خوشی کے گیت گانے لگی ہو۔ اور وہ خود آپ، اپنی اندھی آنکھوں کے باوجود سارے گھر میں ناچتی پھری اور جب سائرہ نے سے ناچتے دیکھ کر پوچھا، تو زہرہ نے ہنس ہنس کر یہ بات آپا سائرہ سے بھی کہہ دی۔ اور آپا سائرہ کے چہرہ پر ایک نامعلوم سی زردی چھا گئی۔ وہ کچھ بول نہ سکی۔ اور غریب زہرہ نے حیران ہو کر آپا سائرہ کی طرف اس طرح دیکھا جیسے وہ اس عجیب بات کے اثر سے پیدا ہونے والی کیفیت کو جاننا چاہتی ہو مگر زہرہ غریب ابھی اس قابل نہ ہوئی تھی کہ ان کیفیات کو سمجھ سکے۔ اور سائرہ اس سے یہ کیفیت بیان نہ کر سکتی تھی۔ یہ تو اس کی ایک عجیب و غریب خواہش تھی جو اس کے دل میں پرورش پانے لگی تھی۔ اور نہ جانے کیوں کئی دن اس کا جی بہت بری طرح یہ چاہنے لگا تھا کہ کوئی جوان لڑکا اس سے بھی ویسے ہی محبت کرنے لگے جیسے یہ منور صابرہ سے کرتا ہے

چھٹا باب

مگر منوّر کے سینہ میں محبت کی جو شیریں ندی پھوٹ پڑی تھی۔ اس کا منبع جوانی
نہ تھی اور نہ اس کا تعلق جسم کی کسی اس مخفی قوت سے تھا جو جوان مرد کو جوان عورت کے
قریب لانے کا باعث ہوتی ہے۔ یہ محبت کچھ انوکھی تھی۔ ہر نوع اور ہر اعتبار سے انوکھی۔
اس کا ایک عنصر تو بچپن کی یکجائی تھی۔ اور دوسرا عنصر تھا صابرہ کی بے بسی۔ منوّر صابرہ کی
موٹی موٹی خوبصورت اندھی آنکھوں کو دیکھتا تو اس کو ایسا محسوس ہوتا جیسے یہ اندھی آنکھیں
ساری فضا میں بے بسی اور بے چارگی کا راگ بن کر پھیل گئی ہیں۔ اور کتنا پھیلاؤ تھا اس راگ کا
اور کتنی خوفناک تھی اس کی کیفیت۔ منوّر پندرہ سال کا ہونے کے باوجود کانپ کانپ اٹھتا
اور کانپتے اور لرزتے وقت اس کا جی بے اختیار چاہتا کہ اپنی اس صابرہ بے بس اور بیچاری
صابرہ کے لئے قدرت کی ہر رعنائی۔ ہر نعمت اور ہر خوبی کے خزانے لوٹ لائے۔ اس کے
پاس کچھ نہ تھا۔ صرف پندرہ برس میں پلا ہوا ایک جسم تھا جسے لوگ کچھ زیادہ اہمیت نہ دیتے
تھے۔ اور اپنے اس جسم کو اس نے اس صابرہ کے لئے محنت اور مشقت کی بھٹی میں ڈال دیا
تھا۔ منوّر کے نزدیک ایک مرد کی محبت کی انتہا یہی تھی کہ وہ اپنے جسم کی ہر قوت اور
ہر کس بل کو اپنی محبوب عورت کے لئے خوشی و مسرت اور اطمینان حاصل کرنے کے لئے مشغول

رکھے۔ اور ایک مستقل مزاج مرد کی طرح نتائج کا انتظار کرے۔ اور منور یہی کرنے لگا تھا۔ وہ صبح سویرے بیلوں کی گردنوں پر ہل کا جوا رکھتے۔ کھیتوں کی طرف بڑھتا نظر آتا اور جب شام ہوتی اور سورج اپنی روشنی کی ہر کرن کو اپنی جھولی میں ڈال کر مغرب کے بچھونے پر جا سوتا تو منور۔ ایک جوان کسان کی طرح محبت اور محنت کے ملے جلے نشے میں جھومتا ہوا گھر کے صحن میں قدم رکھتا۔ زہرہ اپنے دونوں ننھے ننھے بازو پھیلا کر آگے بڑھتی اور چیختی "میرے اچھے بھیا۔ میرے جوان اور توانا بھیا آگئے۔ وہ اس زہرہ کو گلے لگا لیتا اور ایسا کرتے وقت وہ محسوس کرتا کہ وہ جوان بھیا ہی نہیں بوڑھا باپ بھی ہے۔ مگر نہ جانے کیسے، زہرہ کی آواز سن کر صابرہ بھی اندر سے نکل کر برآمدہ کے ایک ستون سے آلگتی۔ اس کے ہاتھ پھیلے ہوتے۔ شاید اس کا جی چاہتا، وہ یہ پھیلے ہوئے ہاتھ منور کی طرف بڑھا دے اور اس کی پگڑی اور اس کا پھاوڑا اس سے اس طرح لے لے جیسے یہ زہرہ ہر شام لے لیتی ہے اس سے آگے وہ سوچ نہ سکتی اور شرما جاتی۔

ابھی وہ چودہ سال کی تھی اور شاید جوانی کی بینائی، اس کے سینہ کی دیواروں میں روزن بنا کر ابھی کئی اور سال پھوٹ نہ سکتی۔ اگر اس کی ماں نہ مر جاتی۔ جب تک ماں زندہ تھی صابرہ کے دل میں کبھی یہ خیال تک پیدا نہ ہوا تھا کہ یہ منور، اس کی جوانی کا ساتھی بنے گا۔ اور شاید اب بھی اسے یہ خیال نہ آتا۔ مگر ظالم رابعہ نے، جس کی جوانی اس پچپن سال عمر کے باوجود چھوٹی پڑتی تھی۔ اس کے بازو میں چٹکیاں لے لے کر اس کے کان میں کئی بار کہا تھا۔

" اری صبو، یہ منور، بڑا اچھا بنتا جا رہا ہے۔ تمہیں اس طرح دیکھتا ہے جیسے یہ تیرا گبرو ہے۔ اور جب وہ تیری طرف دیکھتا ہے اور تیرے پاس کھڑا ہوتا ہے تو ایڑیاں

اٹھا لیتا ہے۔ اور مجھے اسے دیکھ کر ہنسی آجاتی ہے۔ مگر صبو، تیری قسم ایک بات ہے۔ یہ چھوٹی سی عمر یا میں بیچ بیچ کا گبرو معلوم ہونے لگا ہے۔ اور اس کے گھنگریالے سنہرے بال تو پہلے سے کہیں زیادہ سنہرے ہو گئے ہیں۔ اور آنکھیں تو ظالم کی اتنی شریر ہوتی جارہی ہیں کہ میرا جی چاہتا ہے۔ ان شریر آنکھوں کو آگے بڑھ کر اپنے دانتوں کے ساتھ زخمی کر دوں اور صابرہ، یہ آخری بات سن کر رابعہ کی پیٹھ پر ایک زور کا مکّہ دیتی۔ اور سرگوشی کرتی تو بڑی وہ ہے رابو! تو تو میرے منور کی دشمن بنتی جارہی ہے۔

اور رابعہ، نہ جانے کس خیال سے اس صابرہ کو اپنے گرم سینہ سے لپٹا لیتی۔ اور صابرہ کی ایک ایک سانس اور ایک ایک رگ بھڑک اٹھتی۔ اور اس کا جی چاہتا رابعہ کی جگہ منور۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اس سے آگے وہ کچھ نہ سوچ سکتی۔

اور رابعہ تھوڑی دیر اس کے سینہ سے لگی رہنے کے بعد آپ ہی آپ الگ ہو جاتی اور اسے گدگداتی ہوئی کہتی:۔

"صبو، تیرا دل کتنا دھڑکتا ہے۔ یہ کیسے مچلتا اور تڑپتا ہے کیا یہ دھڑکن، اور یہ تڑپ اس لئے تو نہیں کہ تمہارے گبرو نے کبھی اس پر ہاتھ نہیں رکھا؟"

اور یہ سن کر صابرہ رابعہ کے بازو پر اس زور سے کاٹتی کہ اس ظالم کی ساری شوخیاں ماند پڑ جاتیں۔ صابرہ کے پاس یہ بڑا خوفناک ہتھیار تھا۔ اور جب کبھی یہ اپنا خوفناک ہتھیار استعمال کرتی تو رابعہ اسے بری طرح کوسنے لگتی اور چیختی ہوئی کہتی:۔

"خدا کرے یہ تیرے موذی دانت ٹوٹ جائیں۔ کیسے تیز تیز ہیں یہ۔"

اور زہرہ جب کبھی پاس ہوتی تو اس کی یہ بد دعا سن کر صابرہ کے منہ پر ہاتھ رکھ دیتی اور چلّاتی "نہ آپا بی رابعہ، ہماری بے چاری آپا کے لئے یہ بد دعا نہ کرو۔"

اور آپا بی رالعہ چیختی " جی ہاں، یہ تمہاری بی آپا تمہارے بازو پر کاٹیں تو تمہیں پتہ چلے اس کے یہ دانت کتنے نوکیلے ہیں ؟"

اور زہرہ، نہ جانے کیوں آگے بڑھ کر بی صابرہ کے منہ پر اپنا منہ رکھ دیتی ۔ شاید اس طرح وہ ان تیز تیز دانتوں کے اوپر اپنی زبان پھیر کر ان کی تیزی کم کرنا چاہتی تھی ۔ ایک عجیب منظر ہوتا معصومیت اور پاکیزگی کا منظر ۔ دونوں بہنیں ایک دوسرے سے لپٹ جاتیں ۔ اور زہرہ ہمہ تن ماں بن جاتی اور صابرہ کے ہونٹوں، گالوں، اور پھر اندھی آنکھوں کو اس طرح چومنے لگتی جیسے وہ چھوٹی بہن نہیں ماں ہے ۔ اور پاس کھڑی رالعہ کا جی چاہا کرتا اسے بھی ایسی ہی کوئی چھوٹی بہن مل جائے ۔ مگر اس کی چھوٹی بہن رفیعہ تو سپنی تھی ۔ کبھی کبھی غصہ میں آن کر جو چیز ہاتھ میں آتی رالعہ کے منہ پر دے مارتی ۔ اور رالعہ جب مارنے کو دوڑتی تو یہ سپنی ماں کی گود میں جا بیٹھتی ۔ اور چیختی :۔

" ماں ! یہ آپا بی بڑی ظالم ہیں ۔ میرا سارا جسم نوچ کھایا اور ابھی انہیں صبر نہیں ۔ دیکھو کس غصہ میں ادھر بڑھی چلی آ رہی ہیں ۔

اور ماں یہ سن کر رالعہ کو بد دعائیں دینے لگتی ۔ " اللہ کرے تجھے کوئی ایسی ساس ملے جو تجھے ہر وقت جوتی تلے رکھے ۔"

اور یہ ایسی بد دعا تھی کہ رالعہ اسے سنتے ہی اپنا سارا غصہ بھول جاتی ۔ اور شرما کر وہاں سے چلی جاتی ۔ یہ کتنی حسین گالی تھی اس کے لئے، جوانی کے عہدِ آغاز میں ایسی گالیاں جوان لڑکیوں کو نہ جانے کیوں اتنی بھاتی ہیں ۔ اور رالعہ کو تو یہ گالی بہت بھاتی ۔ اس کا جی بہت چاہتا کہ اس کی ماں اس کی شادی کر دے ۔

گاؤں کی کھلی فضا میں پرورش پانے کے باعث، رالعہ اپنی عمر سے کہیں بڑی معلوم

ہوتی - یوں تو وہ صابرہ کی ہم عمر تھی - مگر جب وہ صابرہ اور سائرہ دونوں کے پاس کھڑی ہوتی تو وہ صابرہ کی نہیں سائرہ کی ہم عمر معلوم ہوتی - اور یوں اس کا مزاج بھی اس سائرہ سے زیادہ ملتا تھا - اور اب تو کئی دنوں سے صابرہ کی بجائے وہ سائرہ کے پاس ہی زیادہ بیٹھتی - اور مدہوش ہو کر عجیب عجیب محبت بھرے اور رسیلے گیت گانے لگتی اور صابرہ دور بیٹھی یہ گیت سُن کر آپ ہی آپ شرمانے اور سہمنے لگتی -

جن جوان بچیوں کی مائیں - انہیں بے سہارہ چھوڑ کر عین اس وقت اس دُنیا سے کوچ کر جاتی ہیں جب ان کی بچیاں، بچپن کی منزل کو پھاند کر جوانی میں اترتی ہی ہیں - تو ان کی حالت امتحان کی سی ہوتی ہے - اور صابرہ اور زہرہ تو نہیں - سائرہ اس امتحان کی منزل میں سے گزر رہی تھی - اور اس کا نازک سینہ شاید اب جوانی کے جذبات سے بہت بھر گیا تھا کہ کبھی کبھی وہ مکان کے صحن سے نکل کر اس تنور پر آن کھڑی ہوتی جو پچھلی خوفناک بارش کے باعث اب بیکار ہو گیا تھا - اور جہاں اب محض مرغیاں ہی ہوتیں اور کوئی نہ ہوتا -

یہ ایک اتفاق ہوا یا کوئی جانی بوجھی بات عمل میں آئی کہ اس شام جب دُور آسمان پر ہلکے ہلکے مٹیالے بادل پھیلنا شروع ہو گئے تھے سائرہ، اپنی ماں کی لال اوڑھنی اوڑھے اس تنور پر کھڑی مرغیوں کے سامنے گیلے آٹے کے ریزے پھینک رہی تھی کہ کسی نے اچانک اس کے اُوپر گلاب کا ایک بڑا سا پھُول پھینکا - سائرہ کے ہاتھ سے آٹے والا پیالہ چھوٹ کر نیچے آن گرا - اس کے سارے جوان جسم اور جوان دل پر ایک نامعلوم سا لرزا سا طاری ہو گیا - وہ سولہ سال کی ہو چکی تھی اور اس سولہ برس میں کسی نے یوں اچانک اس پر اتنا خوبصورت اتنا تیز اور اتنا جوان پھُول نہ برسایا تھا - یہ کون تھا؟

یہ کہ اس کی جوانی بھا گئی تھی کیسے - اس مٹیالی اس دھندلی اور اس کی طرح

سہمی سہمی ڈری ڈری شام میں اس پر شوخ اور خوبصورت پھول پھینکنے کا خیال آیا ہے ۔ سائرہ یہ جاننے کی خواہش کے باوجود یہ سوچ نہ سکی ۔ وہ اتنی بڑی بات سوچ ہی کیسے سکتی تھی ، یہ تو قیامت تھی اس کی جوانی کے لئے یہ تو یوم حشر تھا اس کے جذبات و امنگوں کا ۔ اور یہ حشر کون اٹھا سکتا تھا ۔ یہ قیامت کس نے توڑی تھی ؟ سائرہ اسے دیکھنا چاہتی تھی ۔ مگر وہ دیہاتی لڑکی تھی ۔ ایک سید زادی اور پاکیزہ اطوار ماں کی گود میں پلی تھی ۔ اسے آنکھ اوپر اٹھا کر اس شخص کو دیکھنے کی جرأت تک نہ ہوئی ۔

وہ ابھی تک کانپ اور لرز رہی تھی کہ سامنے کھڑی مرغیاں دفعتاً چیخ اٹھیں ، اور شور مچا مچا کر ساری فضا کی شعریت ختم کر دی ۔ سائرہ کی آنکھیں آپ ہی آپ سامنے اٹھ گئیں ۔ اس سے چند قدم کے فاصلے پر سرفراز ، اپنے لمبے چوڑے جوان جسم اور موٹی موٹی کانوں کی طرف پھیلی ہوئی مسکراتی ، آنکھوں کے ساتھ کھڑا اس سائرہ کی طرف اس طرح دیکھ رہا تھا ، جیسے اس سے کہہ رہا ہو : ۔

بی سائرہ ! اب تم جوان ہوگئی ہو ۔ ذرا ہماری طرف دیکھو ۔ ہماری جوانی تمہاری جوانی سے گلے مل کر اسے ایک عجیب راگ سنانا چاہتی ہے ۔

مگر سائرہ ذیلدار کی بیٹی نہ تھی ۔ اس کا باپ ایک غریب سید تھا ۔ اور ماں ایک پڑھی لکھی اور نیک اطوار بی بی تھی ۔ اور یہ دونوں اسے اپنے خون اور اپنی تربیت کے بل پر جوان کرنے کے بعد اسے اس دنیا میں چھوڑ کر چلے گئے تھے ۔ اور اس کے کان میں کہہ گئے تھے : ۔

" سائرہ بیٹی تو جوان ہے ۔ مگر تیری جوانی ایک سید زادی کی جوانی ثابت ہو ۔"

اور سائرہ کو جیسے ماں کی یہ بات ساری فضا میں چیختی چلاتی پھرتی محسوس ہوئی ہو ۔ اس نے سرفراز کی طرف اس غصّہ کی نگاہ سے دیکھا جیسے اس سے کہہ رہی ہو ،" سرفراز ! تم ذیلدار

کے بیٹے ہو، مجھے اس سے انکار نہیں، مگر میں بھی فاطمہ کی بیٹی ہوں - اور میری ماں عصمت اور پاکیزگی کا مجسمہ تھی - وہ نیکی اور بھلائی کا ستون تھی "

مگر سرفراز ابھی تک مسکرا رہا تھا - اور اس کی جوانی تو ہنسی اور قہقہے لگا رہی تھی -

سائرہ کی نسائیت یہ تمسخر برداشت نہ کر سکی - اور بُری طرح چیخی : -

" یہ تم نے کیا حرکت کی، یہ تم جانتے ہو، تم نے کس گھر کی دیوار پھاندی ہے - یہ اس گھر کی دیوار ہے جس کے اُوپر فرشتے اپنے پروں کا سایہ رکھتے ہیں - "

اور سرفراز کچھ نہیں جانتا تھا - اس کی نگاہ میں تو صرف ایک ہی بات تھی - کہ یہ سامنے کھڑی سائرہ جوان ہے، خوبصورت اور نازک اندام ہے - مگر یہ سائرہ تو اس وقت ایک ڈراؤنی رات بن گئی تھی - اس نے اپنے دونوں پاؤں زمین پر اس زور سے مارے، کہ پاس کھڑی سہمی سہمی مرغیاں ایک بار پھر چیخ اٹھیں اور اس بُری طرح چیخیں کہ سرفراز بوکھلا گیا - اس کے ہونٹوں پر پھیلی ہوئی مسکراہٹ ختم ہو گئی - اور اس نے اپنے چاروں طرف دیکھا، احاطہ کی دیوار محض چھ فٹ اونچی تھی اور اس کے قریب سے گزرنے والے لوگ آسانی سے اس میں سے جھانک کر اس کی چوری کو پا سکتے تھے - پہلے اس نے یہ بات نہ سوچی تھی - اگر سوچی ہوتی تو شاید وہ یہ حرکت نہ کرتا - مگر اس وقت وہ اُمیدوں اور آرزوؤں کے بل پر ناچتا اور کودتا ہوا آیا تھا - مگر اب تو اس کی ساری امیدیں اور آرزوئیں برف کی طرح ٹھنڈی ہو گئی تھیں - اسے خیال نہیں تھا کہ سائرہ جوان اور رعنا سائرہ اس کے اظہار محبت پر بُرا مانے گی اس نے بستی کی کتنی جوان لڑکیوں کو اپنا تختۂ مشق بنایا تھا - اور وہ ساری کی ساری کس آسانی کے ساتھ اس کی باتوں میں آ گئی تھیں - اور خود اس سائرہ کی سہیلی مریم کس آسانی سے اس کے پھندے میں پھنسی تھی اور مریم کو اپنے پھندے میں پھانسے ہوئے تو ابھی اسے بیس دن ہوئے تھے

اور مریم کتنی خوش تھی ۔ اس کی جوانی کے عجیب عجیب گیت گانے لگی تھی ۔ اور اس کے جوان چہرے پر اس وقت کیسا عجیب رنگ نکھر آیا تھا جب اس مہینے کے شروع میں اسی قسم کی شام کو وہ مریم کے گھر سے ملے ہوئے "تنور کے احاطہ میں کودا تھا ۔ مریم شرما گئی تھی ، سہم گئی تھی مگر اس کے چہرہ پر یک بیک کیسی رونق آگئی تھی اسے دیکھ کر ۔

مگر ـــــ یہ سائرہ کیسی لال سرخ ہو رہی تھی اس وقت اس کی آنکھیں کتنی خوفناک حد تک پھیل گئی تھیں اور اس نے کس بُری طرح تنور کے قریب پڑا لٹھ اٹھا لیا تھا سرفراز نے بہت غصّہ کے ساتھ اس کی طرف دیکھا اور جیسے دیوار پھاند کر ادھر اُترا تھا ، ویسے ہی دیوار پھاند کر دُوسری طرف جا پہنچا ۔

مگر سائرہ ابھی تک سہمی کھڑی تھی ۔ مرغیاں بھی چیخ اور چلّا رہی تھیں ۔ سائرہ کا دماغ اور دل دونوں ایک عجیب قسم کی بھٹّی بن گئے تھے ۔ نہ جانے یہ بھٹّی کس قسم کی تھی ۔ شاید احساسِ جوانی ، زنانہ اُمنگیں اور کسی جوان مرد کے سینہ پر سر رکھنے کی خواہش اور فاطمہ کی دی ہوئی پاکیزہ تربیت اور نور شاہ کا خوف ، ایک دوسرے پر ختم پانے کی کوشش کر رہے تھے یا کوئی اور بات تھی سائرہ کی انفرادی بات ساری دُنیا کی عورتوں سے کوئی الگ خصوصیت ۔ وہ ابھی غصّہ میں بھری تھی ۔ ابھی پھُوٹ پھُوٹ کر رونے لگی ، اور پھوٹ پھوٹ کر روتے روتے وہ اس بُری طرح چیخ اُٹھی کہ زہرہ باورچی خانہ میں سے نکل کر اس طرف اس بری طرح بھاگی جیسے اسے کوئی قیامت اپنی طرف بلانے لگی ہے ۔

سائرہ نے روتے روتے احاطہ کی دیوار کے ساتھ کمر ٹیک لی تھی ۔ اور آنسو تھے کہ اس کے گالوں پر لڑھکے چلے آ رہے تھے ۔ زہرہ بازو وہیں پر پھیلا کر اس کی طرف لپکی اور اس سے لپٹ گئی ۔ اور سائرہ اپنی اس ننھی بہن پر اس طرح جھک گئی جیسے اسے اپنے دل کے بوجھ تلے دابے دینا چاہتی ہو ۔

ساتواں باب

اس رات جب منوّر ہل کندھے پر رکھے گھر کے صحن میں داخل ہوا، تو زہرہ، آج بازو پھیلائے ہوئے اس کی طرف مسکراتی ہوئی نہیں روتے روتے لپکی۔ منوّر نے ہل ایک دھچکے کے ساتھ زمین پر پھینک دیا اور زہرہ کو اپنے جوان سینہ سے لگاتے ہوئے پوچھا:-

کیوں میری ننھی بہن؟

اور ننھی بہن کچھ کہہ نہ سکی۔ صابرہ پاس آن کھڑی ہوئی تھی۔ وہ بھی رو رہی تھی۔ اور سائرہ تو دروازے کے ساتھ لگی کھڑی اس منوّر کو دیکھ کر اس بُری طرح چیخی کہ منوّر کا مردانہ جسم ایک عجیب قسم کے زلزلہ کے جھٹکے محسوس کرنے لگا۔ وہ ننھی زہرہ کو اپنے اس مردانہ جسم سے لپٹائے برآمدہ کی طرف بڑھا نہیں لپکا۔ اور آپا بی سائرہ کے دونوں ہاتھ اپنے کھردرے ہاتھوں میں تھامتے ہوئے پوچھا:-

"کیوں میری آپا بی، آج یہ تمہاری آنکھیں اس بُری طرح کیوں بہہ نکلی ہیں اور مجھے دیکھ کر تم چیخ کیوں اٹھی تھیں؟"

آپا بی سائرہ اور زیادہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی اور اسے روتے دیکھ کر صابرہ اور زہرہ بھی رونے لگیں۔ شاید ان سب کو ان کی ماں یاد آ گئی تھی۔ اور مری ہوئی ماں جب

یاد آجاتی ہے تو دل ہمہ تن لرزہ اور ہمہ تن آنسو بن جاتا ہے۔ مگر منوّر کی پریشانی لحظہ بلحظہ بڑھتی جاری تھی۔ اس کا مردانہ خون، اور مَردانہ پٹھے، رگیں اور نسیں مردانگی کا اظہار کرنے کے لئے بُری طرح پھڑک اٹھی تھیں۔ اور وہ ہاتھ تو بُری طرح کانپ رہے تھے جو آپا بی سائرہ کے نازک ہاتھوں کو سنبھالے تھے۔ نہ جانے آج ان تینوں کو روتے دیکھ کر اس منوّر کی آنکھوں میں آنسو کیوں نہیں آئے۔ ورنہ اس سے پہلے تو جب کبھی وہ روتیں وہ ان کے ساتھ رونے بیٹھ جاتا۔

اس نے آپا بی سائرہ کے ہاتھوں کو پکڑے پکڑے اس کے چہرہ کی طرف دیکھا۔ اس چہرہ پر کتنی زردی چھائی تھی۔ منوّر کا دل اس زردی کے احساس سے کانپنے لگا۔ اور اس نے کانپتے کانپتے دل کے ساتھ آپا بی سائرہ سے پوچھا:۔

" کیوں آپا بی سائرہ تم کچھ کہتی کیوں نہیں مجھ سے؟ میں تمہارا بھیّا ہوں۔"

اور آپا بی سائرہ نے، اپنے دونوں ہاتھ اس کے ہاتھوں کی گرفت سے نکال کر اس کے کندھے پر رکھ دیئے۔ رونی روتی آنکھوں کے ساتھ اسے دیکھا۔ اور سر کو ایک جھٹکا دیتے ہوئے کہنے لگی:۔

بھیّا منوّر۔ آج ...... آج ...... اس کی زبان دفعتاً رک گئی۔ منوّر ہمہ تن شوق بنتے ہوئے بولا " آپا رکو نہیں کہہ دو —— ساری بات —— اور آپا بی سائرہ نے اس سے یہ بات کہہ دی۔

آج —— سرفراز ہمارے احاطہ کی دیوار پھاند کر اِدھر آدھمکا تھا۔ اور اس نے —— مجھ پر —— ایک پھول —— اس سے آگے وہ کچھ کہہ نہ سکی۔ جوان لڑکی اپنے بھیا سے ایسی پست بات ظاہر نہ کرسکی۔ اور منوّر سب کچھ سمجھ گیا تھا۔ اس کا سارا جسم

شعلۂ جوالہ بن گیا تھا۔ اور دل اور دماغ تو کوہ آتش فشاں کی صورت اختیار کر گئے تھے۔

اس نے اس سے کوئی بات نہیں کی۔ اس کے ہاتھ اپنے کندھوں سے ہٹا دیئے۔ اندر کی طرف لپکا اور باوا کی وزنی کلہاڑی اٹھا کر باہر کی طرف دوڑا۔ تینوں روتی بہنیں کانپنے لگیں۔ اور بُری طرح چیخیں:

"نہ بھیا منوّر۔ یہ بات اچھی نہیں ہے" اور منوّر کے پاؤں اور جسم کو تو انتقام کی بجلی چھو گئی تھی۔ اور وہ تو اندھیرے کی چادر پھاڑتا ذیلدار کے احاطہ کی طرف بھاگ رہا تھا۔

ان تینوں کے دل بُری طرح دھڑکے اور دھڑک دھڑک کر اپنی ساری توانائی کھو دینے کو تھے۔ صابرہ نے اپنی زلفیں اپنی دونوں مٹھیوں میں بھینچ لی تھیں اور روتے روتے سائرہ سے شکایت کر رہی تھی:

"آپا تم منوّر کے غصّہ سے واقف تھیں، پھر یہ بات اس طرح صاف صاف اس سے کیوں کہہ ڈالی" اور آپا بی سائرہ نے روتے روتے اور بلکتے بلکتے جواب دیا۔

"مجھ نکمی کو یہ کیا معلوم تھا کہ منوّر اس طرح بھڑک اُٹھے گا۔" خدا جانے اب کیا ہو۔

تینوں پھر اس خیال پر لرز اُٹھیں اور زہرہ کی معصوم آنکھوں میں تو دفعتاً ایک عجیب چمک پیدا ہو گئی۔ اس نے اپنا دوپٹہ اتار پھینکا اور سرپٹ باہر کو بھاگی۔ وہ اپنے باغ کی طرف بھاگی جا رہی تھی۔ پوری تیزی اور پوری رفتار کے ساتھ اور ابھی وہ باغ کی باہر کی دیوار کے قریب نہیں پہنچی تھی کہ سرفراز باغ سے باہر نکلتا نظر آیا۔ اور زہرہ کی جان میں جان آ گئی۔ وہ یہاں سرفراز سے ملنے نہیں، منوّر کے ابا شاہ جی سے ملنے آئی تھی تاکہ ان سے کہے منوّر کے پیچھے جائیں اور اسے سمجھا کر واپس لائیں مگر سرفراز کو یہاں پایا تو اس کی پریشانی بہت کم ہو گئی۔ اور اس کے سینے سے دل نے عجیب طرح اطمینان کا سانس لیا کہ ابھی کچھ بگڑا نہیں۔ سرفراز اس کے قریب

آن کھڑا ہوا تھا اور سنتے ہوئے پوچھ رہا تھا:۔

" ہماری چھوٹی بی بی اس اندھیری رات میں کیا کرنے یہاں آئی ہیں ؟"

زہرہ کا جی چاہا سرفراز سے ساری بات کہہ دے ۔ مگر یہ عجیب بات وہ اس سے کیسے کہہ دیتی ۔ یہ تو بڑی بُری بات تھی ۔ اس نے سرفراز کی اس بات کا کوئی جواب نہ دیا ۔ اور اپنے ننھے سے دماغ کی ساری ذہنیں جمع کرتے ہوئے بات بناتے ہوئے کہنے لگی :۔

" ذرا سرفراز بھیا ۔ میرے ساتھ باغ کے اندر تک تو چلیئے ۔ شاہ جی بابا ۔ کو آپا بی سائرہ نے بلایا ہے ، وہ کل شام سے گھر نہیں آئے ۔ باغ کو پانی دیتے رہے ہیں شاید ، آپا بی سائرہ اُن سے بڑی ضروری بات کہنا چاہتی ہیں ۔"

اور سرفراز اپنی لمبی قامت اور گٹھیلے جسم کے باوجود اس خیال پر لرز اُٹھا ۔ وہ اس شاہ جی سے بہت ڈرتا تھا ۔ وہ کیا بستی کے سارے لوگ حتیٰ کہ خود ذیلدار جی بھی اس شاہ جی سے بہت مرعوب تھے ۔ وہ اگر ایک طرف ہوتے اور ساری بستی ایک طرف تو بستی کے کسی آدمی کو ان کے خلاف زبان ہلانے کی جُرأت نہ ہوتی ۔ وہ گو بوڑھے تھے ۔ مگر ان کے جسم میں ابھی بڑی قوت تھی ۔ ان کی کمر تو بالکل جوانوں کی طرح سیدھی اور بازو جوانوں کی طرح گٹھیلے تھے ۔ اور سرفراز ابھی اس لئے ان کے پاس آیا تھا ۔ کہ اپنے دل کا یہ ڈر دور کرے کہ ابھی سائرہ نے ان سے اُس کی آج کی بے ہودگی بیان تو نہیں کی ۔ اس نے جوانی کے نشہ میں آ کر یہ بیہودگی کر تو لی تھی مگر جب سائرہ غصہ میں بھری ہوئی لٹھ ہاتھ میں لے کر اس کی طرف لپکی تو وہ اپنا سارا نشہ بھول گیا ۔ اس وقت سے لے کر اب تک وہ سوچتا رہا تھا کہیں سائرہ نے شاہ جی سے یہ بات نہ کہہ دی ہو ۔ شاہ جی ابھی تھوڑی دیر پہلے اسے جس محبت سے ملے تھے ، اس سے اسے اطمینان ہو گیا تھا ۔ اور جوانی کی آرزوئیں پھر سے مچلنے لگی تھیں مگر زہرہ کی یہ بات

سن کر اس کا سارا اطمینان اس سے چھین گیا۔ اور اس کا جی چاہا یہاں سے بھاگ نکلے۔ مگر اسے پھر خیال آیا وہ اگر کسی طرح اس لڑکی کو منا کر آپا سائرہ کے پاس بھیج دے اور کہلوا دے شاہ جی کو نہ بلائے اور اسے معاف کردے تو کتنا اچھا ہو۔ اور اس نے اس خیال سے زہرہ کے دونوں ہاتھ پکڑ لے۔ اور زہرہ آپا سائرہ کی آج کی بات سے اس سے ڈر گئی تھی، اچانک جب اس نے اس کے ہاتھ پکڑ لئے تو سارا ڈر ایک عجیب ڈراؤنا ہیولیٰ بن کر اس کے نھنے سے دماغ پر مسلط ہو گیا اور وہ بری طرح چیخ اٹھی اور سرفراز شاہ جی کے ڈر سے بستی کی طرف بھاگ نکلا اور جیسے ہی وہ بھاگا۔ زہرہ کا سارا ڈر ایک اور ڈر میں تبدیل ہو گیا۔ اور یہ ڈر وہی تھا جو تھوڑی دیر پہلے اسے اس طرف بھگائے لایا تھا۔ اور یہ ڈر اتنا بڑا تھا کہ وہ ایک بار اور چیخ اٹھی۔ اور اس کی چیخ درختوں کے پتوں سے ٹکراتی اور باغ کے اندر بنے ہوئے کنویں کی منڈیر پر بیٹھے وضو کرتے شاہ جی کے کانوں تک جا پہنچی۔ انہوں نے لوٹا ہاتھ سے پھینک دیا۔ اور تہہ بند سنبھالتے ہوئے اس سمت بھاگے جدھر سے یہ آواز آئی تھی اور ابھی وہ رستے ہی میں تھے کہ زہرہ چیختی چلاتی آن پہنچی اور آتے ہی بری طرح ان سے لپٹ گئی۔ شاہ جی کے ہاتھ بڑی بے تابی کے ساتھ اس بچی کے سر پر دوڑ رہے تھے اور زہرہ سسکیاں بھر بھر کر ان سے کہہ رہی تھی:۔

"شاہ جی بابا، جلدی چلئے، گھر کی طرف"

اور شاہ جی بابا اسے گود میں اٹھائے گھر کی طرف بھاگے۔ ان کی سمجھ میں ابھی تک کوئی بات نہیں آئی تھی ہزاروں خیالات ان کے مضبوط دل پر یورش کر رہے تھے۔ کبھی وہ سوچتے کہیں منور کو کوئی حادثہ تو پیش نہیں آ گیا۔ کبھی خیال آیا، صابرہ یا سائرہ کو بچھو یا سانپ نے تو نہیں ڈس لیا۔ مگر انہوں نے اس گود میں بھری ہوئی زہرہ سے کوئی بات نہ پوچھی۔ وہ تھوڑے

دِل کے نہ تھے۔ البتہ ان کے دِل کی پریشانی ان کے پاؤں میں سما گئی تھی۔ اور پاؤں بُہت تیزی کے ساتھ گھر کی طرف بھاگ رہے تھے۔

گھر کا دروازہ آگیا، تو زہرہ آپ ہی آپ ایک جھٹکے کے ساتھ بولی:

"شاہ جی بابا گھر نہ چلیے ذیلدار کی حویلی کی طرف بھاگئے۔ بھیّا منوّر کلہاڑی ہاتھ میں لے کر سرفراز کو مارنے وہاں گئے ہیں۔"

اور شاہ جی بابا کا دِل اور دماغ اور جسم ایک عجیب بھٹّی بن گیا۔ انہوں نے سوچنے کو تو بُہت کچھ سوچا۔ ان کے ذہن میں کوئی بات نہ آئی۔ وہ سمجھ ہی نہ سکے۔ ان کا بچّہ منوّر کلہاڑی ہاتھ میں لے کر سرفراز کو مارنے کیوں گیا ہے۔ ان میں ہمّت نہ ہُوئی کہ اس زہرہ سے کوئی بات پوچھیں اور پھر یہ وقت پوچھنے کا نہیں تھا عمل کا تھا۔ اُنہوں نے اس زہرہ کو گود میں سے اُٹھا کر زمین پر رکھ دیا۔ اور ذیلدار کے گھر کی طرف بھاگے۔ اِنہیں کئی جگہ ٹھوکر لگی۔ ان کے پاؤں کئی بار ان کے شعلہ بداماں جسم کا بوجھ اُٹھانے سے انکار کرنے لگے مگر وہ بھاگتے ہی گئے اور ابھی وہ ذیلدار کی حویلی سے تھوڑے فاصلہ پر ہی تھے اور ابھی انہوں نے سرفراز کو اپنی ڈیوڑھی میں سے نکل کر صحن کی بتّی تلے سے ہوتے بیٹھک کی طرف قدم اُٹھاتے دیکھا ہی تھا کہ اچانک دیوار کے ساتھ سے ایک سایہ سا فضا میں کانپا، دوسرے لمحے ایک سفید سی چیز ہوا میں چمکی۔ شاہ جی ہمہ تن آواز بن گئے اور بُہت زور سے چیخے۔

"کمینے! ہوش کر"۔

مگر منوّر بیٹا تو ہوش کھو چکا تھا۔ کلہاڑی فضا میں چمک کر سرفراز کے کندھے پر پڑ چکی تھی۔ اور فضا سرفراز کی ڈراؤنی چیخوں سے بھر گئی تھی۔

شاہ جی کی آواز تھی یا تھوڑی تھی کہ فضا میں پھیلی قریب قریب بستی کے ہر دروازے

اور ہر کھڑکی پر ایک طوفان اور کڑک بن کر پڑی۔ دروازے کھلنے اور لوگ لالٹینیں ہاتھ میں لے کر ادھر کی طرف بڑھنے لگے جدھر سے یہ آواز آئی تھی۔

سرفراز گر پڑا تھا۔ اور منور کا غصہ شاید سرفراز پر کلہاڑی کا وار کر کے ٹھنڈا ہو گیا تھا۔ یا شاہ جی کی خوفناک اور لرزا دینے والی آواز نے اس کے ہاتھوں کی قوت چھین لی تھی کہ کلہاڑی والا ہاتھ پھر نہیں اٹھا۔ شاہ جی چند قدم کی مسافت پھلانگتے ہوئے سرفراز کے اوپر آن جھکے تھے دفعتاً انہوں نے اپنے گھٹنے زمین پر ٹیک دیئے اور سرفراز کا خونیں سینہ اپنی گود میں رکھ لیا۔ سرفراز کا مضبوط کندھا کافی حد تک کٹ گیا تھا۔ اور شاہ جی، اس لٹکے ہوئے بازو کو کندھے کے ساتھ ملا کر اس پر اپنا صافہ باندھ رہے تھے۔

کہ بوڑھے ذیلدار اپنے کئی آدمیوں کے ساتھ یہاں آن پہنچے۔ ان سب کے ہاتھوں میں کلہاڑیاں، گنڈاسے، تلواریں اور بندوقیں تھیں۔ اور پندرہ سالہ منور کا وہ ہاتھ، جو کلہاڑی کو پکڑے تھا اور جس کی توانائی شاہ جی کی ڈانٹ نے چھین لی تھی پھر اوپر کو اٹھ گیا تھا جیسے وہ ان ساری تلواروں، ان ساری بندوقوں، ان ساری کلہاڑیوں اور گنڈاسوں کا مقابلہ کرنے پر تلا ہے۔ مگر بوڑھے ذیلدار کے ہاتھ میں پکڑی لالٹین کی ساری روشنی شاہ جی کی گود میں رکھے ہوئے سرفراز کے سر اور اس کے کندھے پر پڑ رہی تھی۔ ذیلدار کے ہاتھ کئی بار کانپے اس نے چاروں طرف دیکھا۔ منور پر بھی اس کی نگاہ اٹھ گئی۔ اور ان لوگوں کے ہاتھ بھی فضا میں اٹھے دیکھ لیے جو منور پر لپکنے والے تھے۔

ساری تلواریں گنڈاسے اور کلہاڑیاں فضا میں تیر رہی تھیں کہ بوڑھے ذیلدار کے ہاتھ سے لالٹین نیچے گر پڑی اور وہ چیخا۔

"خبردار! جو کوئی ہاتھ منور پر اٹھا" سارے ہاتھ جہاں تھے وہیں رک گئے

ڑ کی کلہاڑی تو ہاتھ سے چھوٹ کر زمین پر آ رہی ۔

ذیلدار نے ایک اُچٹتی نگاہ اس منظر پر ڈالی اور شاہ جی کے ساتھ بالکل ان ہی کی
رح دو زانو بیٹھ گیا اور ہولے سے پوچھا :۔

" شاہ جی یہ کیا ہوا ؟ "

شاہ جی نے کانپتی ہوئی آواز میں جواب دیا :۔

" میں خود نہیں جانتا یہ کیا ہوا ، ابھی چند لمحے پہلے زہرہ میرے پاس بھاگی بھاگی
گئی اور مجھ سے ڈرتے ڈرتے کہنے لگی ۔ منوّر بھیا کلہاڑی لے کر سرفراز کو مارنے گئے ہیں ۔
میں بھاگا ، مگر شاید تیز نہیں بھاگ سکا کہ منوّر نے سرفراز پر کلہاڑی کا وار کر دیا ۔۔ اور
اب وہ بے حیا سامنے کھڑا ہے ، آپ اس سے بدلہ لے سکتے ہیں ۔ آپ اس کا بازو اسی طرح
کاٹ دیجئے جس طرح اس نے سرفراز کا بازو کاٹا ہے ۔"

اور یہ کہہ کر شاہ جی نے سرفراز کا سر ذیلدار جی کی گود میں رکھ دیا ۔ اپنی جگہ سے اُٹھے
اور بہت زور کے ساتھ چیخے " منوّر ! میرے قریب آؤ ۔ اور اپنی کلہاڑی مجھے دے دو ۔"

منوّر نہ کانپا اور نہ سہما زمین پر جُھکا اور زمین پر پڑی کلہاڑی اٹھا کر شاہ صاحب
کی طرف بڑھا دی اور ان کے سامنے اس طرح کھڑا ہو گیا جیسے وہ غازی تھا اور ابھی شہادت
پانے والا ہے ۔۔ شاہ جی کے ہاتھ میں رکھی کلہاڑی فضا میں بلند ہو گئی ۔ ذیلدار نے کانپ کر
سرفراز کا سر زمین پر رکھ دیا اور چیخے شاہ جی ، میں یہ نہیں ہونے دُوں گا ۔

مگر شاہ جی کا فضا میں اُٹھا ہاتھ نیچے نہیں اُترا ۔ اچانک حویلی کی ڈیوڑھی کے قریب
کھڑا ایک سایہ زور سے لرزا ، اور چیخا :۔

" شاہ جی بابا ! منوّر کو سزا نہ دیجئے ۔ وہ بےغیرت مند ہے ، اور یہ سائرہ کی

آواز تھی ۔ شاہ جی کے ہاتھ سے کلہاڑی نیچے گر گئی ۔ انہوں نے اپنی پیشانی اپنے دونوں ہاتھوں سے تھام لی ، اور جہاں کھڑے تھے وہیں بیٹھ گئے ۔

ذیلدار اپنے زخمی بیٹے کے قریب پھر بیٹھ گیا تھا اور اس نے اس کا بازو اپنے دونوں ہاتھوں میں تھام لیا تھا ۔ اور سائرہ ہولے ہولے ان کے قریب پہنچی تھی ۔ اور منوّر کو اس طرح دیکھ رہی تھی جیسے ایک محبت کرنے والی بہن اپنے غازی بھائی کو دیکھتی ہے ۔ نہ جانے کیسے اس کی نظر ذیلدار کے ساتھیوں کے ہاتھوں میں پکڑی ہوئی کلہاڑیوں ، خنجروں اور تلواروں پر اٹھ گئی اور وہ سر سے لے کر پاؤں تک کانپ اٹھی اور اس نے سوچا ، اگر شاہ جی بابا وقت پر نہ پہنچ جاتے تو یہ ساری تلواریں ، یہ ساری کلہاڑیاں اور بندوقیں میرے منوّر بھیّا کے نازک جسم پر لپک پڑتیں اور اس کی ایک ایک بوٹی فضا میں پھیل جاتی ۔ یہ بڑا خوفناک تخیل تھا ۔ اس نے اس بے وقوف لڑکی کے دل کی عجیب حالت کر ڈالی اور وہ جہاں کھڑی تھی وہیں بیٹھ گئی ۔ اسے ایسا محسوس ہونے لگا جیسے اس کا دل ڈوب چلا ہے ۔

منوّر نے اسے بیٹھتے دیکھا تو اپنی جگہ سے آگے بڑھا اور اپنے دونوں ہاتھ اس کے سر پر رکھ دیئے ، ذیلدار کے آدمیوں کے ہاتھوں میں شاید انتقام کی کھجلی ہونے لگی تھی ۔ اور وہ شاید سمجھ گئے تھے کہ سرفراز پر حملے کا باعث یہی لڑکی ہے ۔ یہ سب دیہاتی ماحول میں پلے تھے ۔ جہالت اور غلط تربیت کے باعث وہ آج تک بڑے فخر کے ساتھ ایسی حرکتیں کرتے چلے آئے تھے ۔ ان کے ماحول میں عورتوں پر اکثر خون خرابے ہوتے رہے ۔ یہ کوئی نئی بات نہ تھی مگر اس منوّر نے ، پندرہ سال کے اس چھوکرے نے بستی کے سب سے بڑے سب سے مالدار اور قریب قریب ساری بستی کے مالک ذیلدار کے اکلوتے بیٹے پر اس سائرہ کے لئے کلہاڑی اٹھائی تھی ۔ اور یہ اَن ہونی بات تھی ، اچنبھا سی بات ، اور اس بات نے ذیلدار کے ٹکڑوں پر

پلنے والے ان لوگوں کی رگوں میں بہنے والے خون کی رفتار بہت تیز کر دی تھی۔ اور وہ سوچ رہے تھے ذیلدار صاحب نے اچھی بات نہیں کی۔ ان کے ہاتھوں کو بے کار سا کر دیا ہے۔ ورنہ یہ ہاتھ اس ذرا سے چھوکرے کی بوٹی بوٹی کاٹ ڈالتے۔ اور ابھی وہ یہی سوچ رہے تھے کہ ذیلدار اور شاہ جی نے مل کر سرفراز کو زمین سے اٹھایا اور اندر لے جانے لگے۔

نھتو، رحیم اور بچو تینوں ان کے ساتھ ساتھ اندر گئے، بالو، خدابخش اور رمضان پیچھے رہ گئے۔ اور ان تینوں بدمعاشوں نے، منور کو للکارا "کیوں بے بڑا خون جوش مار رہا ہے تمہارے ان پٹھوں میں"۔

منور اس وقت کسی اور دنیا میں تھا۔ اس کے سامنے سائرہ سر کو دونوں ہاتھوں سے تھامے ابھی تک بیٹھی تھی، نسائیت اور پاکیزگی کے اس مجسمے کو دیکھ دیکھ کر اس کی رگیں کچھ سردی سی محسوس کرنے لگی تھیں۔ اس نے ان کی یہ طنز نہیں سُنی۔ سائرہ کو بازوؤں سے پکڑ کر اٹھایا اور ہولے سے کہنے لگا:۔

"آپا بی! چلو گھر، تم کیوں آئیں یہاں؟

اور ان تینوں شہدوں نے، ایک بار پھر ان دونوں کو دیکھا، سائرہ کا جسم کتنا سبک اور چہرہ کتنا رعنا تھا۔ ان میں سے کسی نے بھی آج تک اس جیسی خوبصورت لڑکی نہیں دیکھی تھی اور دیکھتے ہی کیسے، سائرہ کبھی باہر نکلی ہی نہ تھی، بی بی جی جب تک زندہ رہیں انہوں نے اپنی کسی بیٹی کو باہر قدم رکھنے نہیں دیا۔

ان لچوں نے، اس سائرہ کو اچھی طرح دیکھنے کے لئے اپنے پاؤں کئی بار زور زور سے زمین پر مارے جواب میں منور نے شعلہ بداماں آنکھوں کے ساتھ ان کی طرف دیکھا اور وہ تینوں قہقہے مار کر ہنسنے لگے۔ اور منور کے جسم کی ایک ایک رگ پھر پھڑک اُٹھی، یہ تو

سائرہ نے اس کے دونوں ہاتھ پکڑ کر اسے آگے بڑھا دیا ، ورنہ اس کی کلہاڑی ان میں سے کہ ایک کا سر تو کھول دیتی ۔

یہ بڑی اندھیری رات تھی ، اور اس اندھیری رات میں وہ دونوں ایک دوسرے کا ساتھ لگے آگے بڑھ رہے تھے ۔ اور آج سائرہ اس منور کے ہاتھوں میں ہاتھ دیئے ہوئے اس اندھیرے میں آگے بڑھتے وقت ایسا محسوس کر رہی تھی جیسے یہ منور شاہ جی بابا کا بیٹا اس کے بادا کا بیٹا اور اس کا حقیقی بھائی ہے ۔

محبت کا وہ دھارا ، جنسیت کی وہ لہر ، جو جوانی میں کسی لڑکی کو کسی نوجوان لڑکے سے قریب کرتی ہے ، ہمیشہ ہمیشہ کے لئے سو گئی تھی اور اس کی جگہ ایک ایسی لہر ان دونوں کے ہاتھوں کی رگوں کو جھولا جھلاتی دونوں کے دلوں کی طرف بڑھ رہی تھی جو خون کے اشتراک کے باعث بہن کو بھائی سے اور بھائی کو بہن سے قریب سے قریب تر کر دیا کرتی ہے ۔

اندھیرے ہی اندھیرے میں آگے بڑھتے ، وہ اپنے گھر کے صحن کے قریب آن پہنچے ۔ اور صابرہ دونوں دروازہ سے لگی کھڑی ابھی تک رو رہی تھیں ۔ ان دونوں کو قریب آتے دیکھ تو زہرہ بجلی کی سی تیزی کے ساتھ اپنی جگہ سے اچھلی اور منور سے لپٹ گئی اور نہ جانے کیسے صابرہ نے دھندلی دھندلی آواز میں پوچھا " کیوں زہرہ تم کہاں بھاگ چلیں ؟ "

اور زہرہ چیخی " بھیا منور واپس آگئے ۔

صابرہ کی آواز کانپ گئی ، " انہیں کچھ ہوا تو نہیں ۔ انہیں کوئی چوٹ تو نہیں آئی

زہرہ کی جگہ اب سائرہ نے جواب دیا :-

" نہیں صبو ! میرے منور کو کچھ نہیں ہوا ۔ اللہ نے اس کو بال بال بچا لیا ۔ شاہ جی عین اس وقت وہاں پہنچ گئے ۔ جب اس نے سرفراز پر کلہاڑی کا وار کیا ۔"

اور اندھی صابرہ ، اس وار کے تخیل پر کانپ اٹھی۔ اس نے کلہاڑی پر کئی بار ہاتھ تو پھیر کر دیکھا تھا۔ مگر کبھی اس کلہاڑی کو فضا میں اٹھتے اور پھر انسانی جسم پر گرتے ہوئے نہ دیکھ سکی تھی بے چاری کی آنکھیں ہوتیں تو یہ کیفیت دیکھتی۔ مگر یہ کیفیت نہ دیکھنے کے باوجود وہ اس کی خوفناکی سے آگاہ تھی۔ اور اس نے اپنے دونوں پھیلے ہوئے ہاتھ اپنے ننھے سے سر پر رکھ لئے۔ اور کسی قدر گڑگڑاتی ہوئی آواز میں بڑبڑائی۔

" میرے اللہ، تو کتنا اچھا اور تو کتنا مہربان ہے۔ منور کا بال بال تو نے بچا لیا۔"

اور نہ جانے کیسے اچانک ایک خوف سا اس پر طاری ہو گیا۔ اس کے الفاظ کانپ گئے۔

" اگر میرے اللہ منو کو کچھ ہو جاتا تو پھر ہائے۔" وہ اس سے آگے کچھ کہہ نہ سکی۔ اس کا نازک سا کلیجہ کانپ اٹھا اور وہ جہاں کھڑی تھی وہیں گر پڑی۔ ان تینوں نے ایک یکساں لرزے کے ساتھ اسے زمین سے اٹھایا اور اندر لے گئے۔

اور یہ اندھی صابرہ نہ جانے آج کیسے ایک عجیب اور خوفناک الجھاؤ میں الجھ گئی تھی۔ وہ سوچ رہی تھی کیا یہ منور اتنے لوگوں سے دشمنی مول لینے کے بعد زندہ بچ سکے گا۔ اور اگر وہ زندہ نہ بچا، تو پھر کیا ہوگا۔ کیا ہم سب زہرہ، میں اور آپا سائرہ اس صدمے سے مر نہ جائیں گے؟

وہ اندھی یہ سوچ رہی تھی اور منور کچھ عجیب عجیب باتیں سوچ رہا تھا۔ اس کا جی چاہ رہا تھا، بابا سے کہے:۔

" بابا! چلو ان تینوں بہنوں کو یہاں سے لے کر کسی ایسی بستی میں جا بسیں جہاں کے لوگ ان کی عصمت و پاکدامنی پر انگلی اٹھانے کی جرأت نہ کر سکیں۔"

مگر ایسی بستی کون سی تھی۔ بھولا منور اس دنیا کے حالات سے واقف نہ تھا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ یہ دنیا تو جیب سے بنی ہے اس میں بسنے والوں کے طور و طریق ایسے ہی جابرانہ قاہرانہ اور

بے ہودہ رہے ہیں۔ اور اب تو یہ بے ہودگی بہت بڑھ گئی ہے پہلے سے بھی زیادہ۔

ان چاروں پر آج عجیب قسم کا خوف و ہراس طاری تھا۔ ایک عجیب دہشت ان سب کے جسموں پر مسلط تھی۔

اور ادھر، ذیلدار کے مردانے میں بستی کا جرّاح، سرفراز کے کندھے کے زخم سی کر اس پر پٹی باندھ رہا تھا۔ سرفراز کا کافی خون بہہ گیا تھا۔ اس کی جوانی بہت بری طرح ماند پڑ گئی تھی۔

اس کے تھوڑے فاصلہ پر ذیلدار اور شاہ جی دونوں ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے اسی طرح چپ چپ کھڑے جیسے یہ صدمہ ان دونوں کا صدمہ ہے۔ ان دونوں نے ابھی تک آپس میں بات چیت نہ کی تھی۔

ذیلدار نے دو تین بار شاہ جی بابا پر طنز کے تیر چلائے بھی تھے۔ مگر شاہ جی بابا، جواب میں کچھ بولے نہ تھے۔ یہ بولنے کی بات ہی نہ تھی۔ ان کے بیٹے نے ایک ایسی حرکت کی تھی جس سے ان کا سر جھک گیا تھا اور زبان گنگ تھی۔

ان کی عمر اس وقت ستر سال کی ہو چکی تھی۔ اور یہ ستر سال انہوں نے اسی بستی میں بسر کئے تھے۔ اور انہیں اچھی طرح یاد تھا کہ ذیلدار اور وہ آپس میں آج سے چونسٹھ سال پہلے سے لے کر اس وقت تک، ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ رہے تھے۔ اور ایک دوسرے کے احساسات اور جذبات سے خوب واقف تھے۔ اور ذیلدار اس وقت جو کچھ سوچ رہا تھا، وہ شاہ جی کو معلوم تھا اور وہ اپنی اور ذیلدار کی زندگی کے اس سب سے بڑے اور ہولناک حادثے کو کیسے بھول سکتے تھے، یہ حادثہ نہ تھا ایک طوفان تھا اور اس حادثہ سے جو ابھی تھوڑی دیر پہلے ہوا لاکھوں گنا بڑا حادثہ تھا۔

اور یہ بڑا حادثہ اس وقت ہوا تھا جب شاہ جی، ذیلدار صاحب اور سائرہ کا باپ

نورشاہ مرحوم پندرہ سال کے تھے۔ یہ تینوں اکٹھے سائرہ کی والدہ فاطمہ کے باپ محمد شاہ جی سے پڑھا کرتے، فاطمہ اس وقت جوان ہوگئی تھی۔ اور ان تینوں سے پردہ کرتی تھی مگر تین سال پہلے ان تینوں کے ساتھ پڑھتی اور کھیلتی۔ اور یہ تینوں ایک جیسی تیزی کے ساتھ اس سے محبت کرنے لگے اور یہ محبت تینوں کے دلوں میں اب کچھ ایسی جوان ہوگئی تھی کہ تینوں ایک دوسرے سے کھنچنے لگے۔ اور جوانی اور عشق نے ان تینوں کے دلوں میں ایک ایسی آگ بھر دی کہ تینوں یوں تو روزانہ محمد شاہ جی سے اکٹھے پڑھتے۔ مگر، ایک دوسرے سے کھل کر بات نہ کرتے اور ان کے دلوں کی یہ خلیج تو اس رات پھیل کر سمندر کی وسعت اختیار کر گئی۔ جب ایک اندھیری رات کے پچھلے حصہ میں وہ تینوں ایک ہی ارادہ سے شاہ جی کے گھر کی طرف بڑھے۔

فاطمہ بی بی رات کے اس حصہ میں قرآن کی تلاوت کیا کرتیں۔ وہ باپ کی طرح اس جوانی ہی میں عبادت و ریاضت میں بڑے بڑے متقیوں سے آگے بڑھ گئی تھیں۔ رات کے اس حصہ میں چونکہ ساری بستی میں خاموشی ہوتی اور اس بات کا قطعاً کوئی امکان نہ ہوتا کہ کوئی غیر آدمی فاطمہ بی کی آواز کو سن لے گا۔ اس لئے وہ بڑے اطمینان کے ساتھ پوری خوش الحانی سے قرآن کی تلاوت کرتیں۔ اور ان کی آواز میں کتنی شیرینی کتنا رس اور کتنا سوز تھا۔ اس کی گہرائی اس کی عظمت تو کوئی ان تینوں دیوانوں سے پوچھتا جو تھوڑے تھوڑے فاصلہ پر چھپے فاطمہ بی کو قرآن پڑھتے سن رہے تھے۔ آہ یہ بھی کیا زمانہ تھا کہ ان دیوانوں کی محبت کی انتہا بس اتنی تھی کہ وہ فاطمہ بی کو قرآن پڑھتے سنیں، دیکھیں نہیں۔ اور اس رات، ضمیر احمد (ذیلدار) نے س رسم عشق کی خلاف ورزی کر ڈالی۔ وہ کھڑکی کے قریب آیا۔ اور اُچک کر فاطمہ بی کو دیکھنے لگا۔ ایک آفتاب تھا جو اس کے سامنے تھا۔ مگر ابھی وہ اس آفتاب کو اچھی طرح دیکھنے نہ پایا تھا کہ ایک چاقو اس کی کمر میں چبھا اور وہ تیورا کر پیچھے کی طرف گرا۔ فاطمہ بی تڑپ کر اٹھیں

شاہ بابا کو جگایا، شاہ بابا باہر آئے، ضمیر احمد کو اس بُری طرح زخمی اور سلطان احمد کے ہاتھ میں چمکتا چاقو دیکھا۔ تو غصہ میں بھر گئے۔ انہوں نے زور کی دو چپتیں اس کم بخت کو دیں اور وہ دُور جا گرا اور نور شاہ کی مدد سے ضمیر احمد کو اٹھا کر گھر لائے۔

آج فاطمہ بی نے خود مرہم پٹی کی اس ضمیر احمد کی، اور سلطان احمد باہر کھڑا کانپتا رہا اور پھر بڑے شاہ جی اس سلطان احمد سے اتنے ناراض ہوئے کہ انہوں نے اسے اپنی شاگردی سے نکال دیا۔

ضمیر احمد کے زخم کاری نہیں لگا تھا۔ وہ اچھا ہو گیا۔ اور بی فاطمہ نور شاہ سے بیاہ دی گئی۔

آج دونوں بڈھے ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ دیئے یہی بات سوچ رہے تھے۔ اور ذیلدار کا دماغ یہ بات سوچتے وقت کئی بار کانپ کانپ اُٹھا، اور آخر میں اس نے سوچا میری بار بھی یہ سلطان احمد جیتا اور میرے بیٹے کے وقت بھی اس کے بیٹے نے فتح پائی۔ مگر تصور کی اس تلخی کے باوجود انہوں نے اپنا ہاتھ شاہ جی بابا کے ہاتھ سے پرے نہیں کھینچا۔

ذیلدارنی ان دونوں کے ماضی کی اس داستان سے واقف تھی جب شاہ جی بابا نے اس کی کئی چوٹیں پی لیں اور کسی فقرے کا جواب نہیں دیا تو تنگ آ کر شاہ جی بابا کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولی:۔

آخر میں پوچھتی ہوں۔ یہ ہر بار تمہاری کیوں فتح ہوتی ہے۔"

ذیلدار نے بہت بُری طرح گھور کر اسے دیکھا اور اس کا ہاتھ شاہ جی بابا کے کندھے پر سے ہٹاتے ہوئے گرجا:۔

" دیکھو رحمت! تم میرے اور سلطان کے بارہ میں یوں نہیں سکتیں تم نہیں جانتیں۔"

دونوں نے ایک ہی وقت اور ایک ہی جگہ اس دُنیا میں آنکھیں کھولیں ۔ اور ستّر سال تک اکٹھے رہے اور انشاء اللہ اکٹھے ہی مریں گے "

رحمت نے ذیلدار کی اس گرج کی کوئی پروا نہ کی ۔ اس انداز میں چیخی :۔

" مگر وہ تمہارا ذاتی معاملہ تھا اور یہ میرے بیٹے کی بات ہے "

ذیلدار کے سارے جسم کو نہ جانے کس بجلی نے چھو لیا اور سر سے لے کر پاؤں تک کانپ اُٹھا اور اس کے مُنہ سے الفاظ نہیں شعلے نکلنے لگے :۔

" رحمت ! تم شاید نہیں جانتیں ، تیرے بیٹے نے فاطمہ کی بیٹی پر بُری نیت کی تھی اور میرے رب کی قسم مجھے یہ معلوم نہیں ہوا ورنہ میں تیرے بیٹے کی دونوں آنکھیں چھید ڈالتا "

اور نہ جانے پھر اس ذیلدار کو کیا ہوا اس کی آواز دفعتاً مدھم پڑ گئی :۔

" رحمت ! مجھ سے قسم لے لو ، جب سے میری زندگی میں وہ واقعہ ہوا جس کا تُو نے طعنہ دیا ہے ۔ اس وقت کے بعد سے میں نے فاطمہ بی کے چہرہ پر کبھی نظر نہیں اُٹھائی ۔ وہ میرے لئے میری ماں ، میری بہن اور نہ جانے ان دونوں سے بھی کتنی زیادہ محترم بن گئی تھی "

اور رحمت نے پھر کچھ نہیں کہا ۔

سرفراز کی حالت کچھ بہتر ہو گئی تھی اور جرّاح کی دی ہُوئی بے ہوشی کی دوا نے اسے سلا دیا تھا ۔

اور اس رات جب دونوں بڈھے ایک دوسرے سے الگ ہُوئے ، تو دونوں کی آنکھوں میں آنسو تھے اور دونوں نے ایک دفعہ نہیں تین تین بار ایک دوسرے کو سینہ سے لگایا اور پیشانی چُوم لی ۔

آٹھواں باب

آج مریم نے سائرہ کا گریبان چاک کر دیا تھا۔ وہ بالکل پاگل ہوگئی تھی۔ اور منور کے سارے کپڑے تو اس نے اندر سے نکال کر باہر صحن میں پھینک دیئے تھے۔ اور یہ تینوں بہنیں حیران تھیں کہ اس دیوانی کو کیا ہوا۔ وہ نہیں جانتی تھیں کہ اس دیوانی کا دل تو اس سرفراز سے اٹک گیا تھا جسے ان کے منور نے رات بُری طرح زخمی کر دیا تھا۔ اور یہ خبر تو اس پگلی مریم کے دماغ اور دل پر ایک خوفناک ایٹم بم کی طرح گری تھی۔ اس کے وہم و گمان میں بھی یہ خیال نہیں آسکتا تھا کہ پندرہ سال کا یہ منور، بائیس سال کے جوان اور بلند قامت سرفراز پر کلہاڑی سے حملہ کرے گا اور مریم کیا بستی کے کسی مرد اور عورت کو یہ گمان نہ ہوسکتا تھا مگر اب تو یہ ہوچکا تھا۔ اور مریم اور رابعہ دونوں صبح صبح ہی اس خبر سے واقف ہوکر سرفراز کو دیکھ آئی تھیں اور پگلی مریم کی حالت اس وقت کتنی قابلِ رحم تھی جب اس نے سرفراز کو پلنگ پر پڑے پایا تھا۔ وہ سہمی سہمی اس کے قریب گئی تھی۔ اگر رابعہ ساتھ اور زبیدہ وہاں بیٹھی نہ ہوتی تو یہ مریم اپنی پوری بے تابیوں کے ساتھ اس سرفراز سے لپٹ جاتی اور اس سے بعد رو کر کہتی:-

میرے آقا! میں اس منور کا منہ نوچ لوں گی جس نے اس قدر گستاخی کی۔ مگر وہ کچھ کہہ نہ سکی تھی، البتہ اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے۔ مگر اس نے یہ آنسو بھی منہ دوسری

طرف کر کے پونچھ دیئے تھے ۔ وہ اس زبیدہ کے سامنے رونا نہیں چاہتی تھی جو ابھی تھوڑی دیر پہلے اپنے بورڈنگ سے بھیا کی خبر سُن کر یہاں آئی تھی وہ بڑی شاطر تھی ۔ وہ ایسے رونے کی تہہ کو پالینے میں بڑی مہارت رکھتی تھی ۔ اور اب بھی جب کہ مریم نے اپنے آنسو پونچھ ڈالے تھے ۔ زبیدہ نے اس کی سُوجی سُوجی آنکھوں سے اس کے دل کا راز پالیا تھا اور کسی قدر مسکرادی تھی ۔ مریم وہاں ٹھیر نہ سکی اور رابعہ کا ہاتھ پکڑ کر وہاں سے بھاگ آئی اور یہاں تو اسے شرم نہ تھی ۔ سائرہ تو اس کی سکھی تھی ۔ بچپن کے سولہ سال انہوں نے ایک ساتھ گزارے تھے ۔ اور اس مریم کا جی تو یہاں پہنچ کر اس طرح بے کل ہوگیا تھا کہ اگر زہرہ اس کے ہاتھ نہ پکڑ لیتی تو وہ سائرہ کا مُنہ نوچ لیتی ۔ آخر سرفراز نے ایسی کیا بری حرکت کر دی تھی ۔ بستی کا لڑکا تھا ۔ اور بستی کے لڑکے ایسی حرکتیں ان جانے بوجھے کر ہی دیتے ہیں ۔

زہرہ نے اس کے ہاتھ پکڑ لئے تو اس کا جی چاہا وہ اپنا سارا غصّہ اس پر نکال دے اور اس نے سوچے سمجھے بغیر اس کو بہت بُری طرح پرے دھکیل دیا ۔ زہرہ کی آنکھوں میں آنسو آجانے کو تھے ۔ مگر سائرہ نے بہت جلدی اسے اپنے سینہ سے چمٹا لیا اور مریم کو ڈانٹتے ہوئے کہنے لگی :-

" بڑی بری بات ہے مریم ۔ تم اتنی بے قابو ہُوئی جارہی ہو ۔ اس زہرہ کا کیا قصور ہے اس میں "

اور مریم پھٹ پڑی :-

" اور تیرا ابھی کوئی قصور نہیں ہوگا ۔ بڑی آئی پاک دامن کہیں کی ۔ اگر ایسی ہی پاک دامن ہے تو اس موئے منوّر کو کیوں آنے دیتی ہو ۔ وہ بھی تو آخر غیر ہے "

سائرہ نہیں صابرہ چیخ اُٹھی " وہ کیسے غیر ہوا ۔ اس کے باوا ہمارے تایا ہیں

اور پھر وہ ہم سب کا بچپن کا ساتھی ہے۔"

مریم چیخی "اور بچپن کے ساتھی کیا غیر نہیں ہوتے۔ کیا ان کے پاس جوان لڑکیوں کو بیٹھنے شرم نہیں آتی۔ اور میں جانتی ہوں بی صابرہ، تو تو اندھی ہے۔ یہ تیری آپا بی سائرہ کس محبت سے اس کے ساتھ ہو ہو کر بیٹھتی ہے۔"

اور سائرہ اس بہتان پر اس مُنہ پھٹ مریم کو کوئی جواب نہ دے سکی۔ وہ صرف رو پڑی۔ اسے اپنی مری ہوئی ماں یاد آگئی۔ اور اس نے سوچا اگر ہماری ماں نہ مرتی تو یہ طوفان کیوں اُٹھتا۔ ان کی زندگی میں تو کسی کو یہ جرأت نہ تھی کہ ہمارے صحن میں جھانک ہی سکتا اور آہ ماں کے مرتے ہی لوگ دیواریں پھاند کر اندر آنے لگے۔

مریم کا غصّہ شاید کچھ دھیما پڑ گیا۔ سائرہ آخر اس کی سہیلی تھی اس نے جو باتیں کیں تھیں غصّہ میں کہہ دی تھیں۔ سائرہ کے رونے سے اس کے غصّہ کی آگ ماند پڑنے لگی۔ اور اس نے چند لمحے بعد سائرہ کو اپنے سینہ سے لپٹا لیا اور جب صابرہ اور زہرہ باہر صحن میں جا بیٹھیں تو مریم نے بہت دھیمی دھیمی آواز میں جیسے کوئی سُن نہ لے۔ سائرہ سے اپنی اور سرفراز کی باہمی محبت کی داستان کہہ ڈالی۔ اور سائرہ کچھ پہلے ہی سمجھ گئی تھی۔ اب اچھی طرح سمجھ گئی تو اس نے اس سے ہمدردی ظاہر کرتے ہوئے کہا۔

"مریم برا نہ ماننا۔ مجھے تو سرفراز کے طور طریق اچھے نہیں معلوم ہوتے۔ اگر وہ اچھا آدمی ہوتا تو تم سے محبت کرنے کے بعد یہ بے ہودگی کیوں کرتا؟"

اور پھر بہت ہی دھیمی آواز میں اس کے کان میں سرگوشی کی۔

"مریم! تیری ماں عزّت رکھتی ہے۔ خدا کے لئے کوئی ایسی حرکت نہ کر بیٹھنا، جو تیری ماں کو کہیں مُنہ دکھانے کے قابل نہ رکھے۔

اور مریم ایسی ایک حرکت نہیں کئی حرکتیں کر چکی تھی۔ وہ تو پچھلے بیس دن سے متواتر سرفراز کی تختۂ مشق بن رہی تھی۔ اس سرفراز نے تو اسے پہلی ہی رات لڑکی سے عورت بنادیا تھا۔ اور پچھلے بیس دن میں تو سرفراز نے اس کے جسم کو اتنی لذتیں اور اتنی مسرتیں عطا کردی تھیں کہ اس کے جسم کی رگ رگ اور نس نس ایک عجیب راگ گانے لگی تھی۔ اس کا جی چاہا وہ سائرہ سے اپنی اس عجیب و غریب تبدیلی کی بات کہہ دے مگر ابھی اس میں شرم باقی تھی۔ ابھی وہ ایسی باتیں اپنی سہیلی سے کہہ نہ سکتی تھی۔ جو اسے عفت و پاک دامنی کی نصیحت کر رہی تھی

سائرہ جہاندیدہ نہ تھی۔ اگر وہ جہاندیدہ ہوتی تو مریم کی آنکھوں کی مستی اور جسم کی لچک سے وہ اس کی اس تبدیلی کا راز پالیتی۔ مریم تو اس وقت سرفراز کے ساتھ بیتے ہوئے دنوں کے تصور ہی سے ایک ایسی لذت پا رہی تھی کہ اس کی رگ رگ اور نس نس پھڑک رہی تھی اور سائرہ مجسمۂ حیرت بنے اس مریم کو دیکھ رہی تھی اور سوچ رہی تھی کہ ابھی چند لمحے پیشتر اس کے غصّہ کا کیا عالم تھا اور اب یہ کس قدر چہکنے لگی ہے۔ اور اس چہکتی مریم نے نہ جانے کس تصور میں اپنی گوری گوری گداز گداز باہیں سائرہ کی گردن میں ڈال دیں اور اس کے کان کے قریب مُنہ لے جاتی ہوئی بولی :۔

" اری سائرہ تو بڑی بھولی ہے۔ تُو تو کچھ بھی نہیں سمجھتی۔ تجھے تو کچھ بھی نہیں معلوم "

اور سائرہ نے اس کی باہوں کو پرے ہٹاتے ہوئے جواب دیا :۔

" بی بی! مجھے معاف کرو، میں جیسی بھی ہوں اچھی ہوں۔ خدا کرے مجھے کچھ معلوم نہ ہو "

اور مریم اس کے گالوں سے کھیلتے ہوئے کہنے لگی :۔

" تو تو پگلی ہے۔ تو تو بے وقوف ہے تجھے کیا معلوم جب محبت کرنے والا گبرو پاس ہوتا ہے، تو جوان لڑکی کی کیا حالت ہوتی ہے "

اس سے آگے وہ کچھ کہہ نہ سکی۔ سائرہ نے اس کے بولتے اور مسکراتے ہونٹ بند کر دیئے اور مریم اَدھ موئی سی ہو کر اس کی گود میں لیٹ گئی۔ اور سائرہ سوچنے لگی یہ مریم کیسی بدل گئی ہے پہلے تو اس نے کبھی ایسی حرکتیں نہیں کی تھیں۔ کیا جوان لڑکیاں گبرو مردوں کے پاس بیٹھ بیٹھ کر اس قسم کی مستانی بن جاتی ہیں۔ یہ خیال اس کی ذہنی پاک دامنی کے لئے ایک پتھر تھا۔ بھاری اور بوجھل پتھر اور اس نے اپنے سر کو ایک زور کا جھٹکا دے کر اپنے ذہن کو اس سے پاک کر ڈالا

اچانک رابعہ ناچتی اور کودتی ہوئی اندر آگئی۔ یہ رابعہ بھی عجیب مخلوق تھی۔ یہ تو اچھا خاصا چھلاوا تھی۔ اس کے جسم میں تو بجلیاں بندھی تھیں۔ قیامتیں اور حشر تھے جو اس کے چھوٹے سے نازک سبک سبک سے جسم میں سمائے تھے۔ اور آج تو وہ بہت چہیلی ہوئی تھی۔ مریم اور سائرہ نے اسے ناچتے اور اُچھلتے کودتے دیکھا تو حیرت سے پوچھا۔

اری ربّو! یہ تو آج اس بری طرح ناچ کیوں رہی ہے۔ اور ربّو پہلے ہی کی طرح ناچتی ہوئی بولی :-

"اجی ناچ اور کود رہی ہیں۔ ہماری مرضی کیوں تم دونوں کو اس پر اعتراض ہے؟"

مریم قہقہہ مار کر ہنسی "اجی سرکار! ہمیں کیا اعتراض ہو گا۔ آپ اندر نہیں، باہر سڑک پر جا کر ناچیں ہماری بلا سے" اور رابعہ نے غصّہ کے ساتھ جواب دیا۔

"آپا یہ تم بہت چہیلنے لگی ہو۔ اس موئے سرفراز نے تمہیں کیا مُنہ لگا لیا۔ چہیلی نہیں سماتیں" اور مریم اپنی جگہ سے اُٹھ بیٹھی اور رابعہ کو مارنے دوڑی۔ رابعہ تو چھلاوہ تھی پھدک کر صحن میں جا پہنچی اور وہیں سے چیخی!

"اجی ہمارے منّو مہاراج نے بھی ایسا بھرپور وار کیا ہے اس ۲۲ سال کے گبرو پر کہ چھٹی کا دُودھ یاد آگیا ہے حضرت کو۔ اور پھر آپ ہی آپ ناچتے اور کودتے ہوئے چیخنے لگی

"ہمارے منّو مہاراج زندہ باد"

اور نہ جانے کیوں اس کی اس بے ہودہ گوئی میں زہرہ کی آواز بھی شریک ہوگئی۔ اور دونوں مل کر "منّو بھیّا زندہ باد" کے نعرے لگانے لگیں۔ اور مریم پر جیسے پھر پہلے ہی سا جنون طاری ہوگیا۔ وہ دوپٹہ سر سے پھینک اندر سے اس تیزی کے ساتھ باہر کو لپکی کہ رتّو کی ساری تیزی دھری کی دھری رہ گئی اور اس مریم نے دونوں بازو پھیلا کر اسے بُری طرح اپنی گرفت میں لے لیا۔ اور اس قدر ٹھوکاٹی کی کہ رالعہ بیچ بیچ رو پڑی۔ اور جہاں کھڑی تھی وہیں ننھی بچیوں کی طرح بیٹھ کر آنسو بہانے لگی۔ اور آنسو بہاتے بہاتے نہ جانے دفعتاً کیوں چیخ اُٹھی :۔

آپا بی مریم، ہم نے بھی تم سے آج کا بدلہ نہ لیا تو تم بھی کیا یاد کروگی۔ دیکھو یہ تمہاری ساری مستی کیسے نکلواتی ہوں۔ ابھی ابّا سے جاکر کہتی ہوں ناکہ تو اس موئے سرفراز سے ہر روز ملنے جاتی ہے۔"

اور مریم یہ اعلان نہ چاہتی تھی وہ تو یہ خبر صابرہ اور زہرہ سے بھی چھپانا چاہتی تھی مگر اس مُنہ پھٹ نے اس کا راز عام کردیا۔ اور اس کی ساری شوخی ہوا ہوگئی۔ وہ بڑی تیزی سے آگے بڑھی اور رالعہ کو اپنے دونوں بازوؤں میں چھپا لیا اور اس کے چہرے پیشانی، اور مانگ میں اتنے بوسے دیئے کہ اس کا چہرہ لال سُرخ ہوگیا۔ اور ہونٹ مسکرانے لگے۔

سائرہ بھی باہر آگئی اور اس مریم کو حیرت سے دیکھنے لگی اور سوچنے لگی اس مریم کو نہ جانے کیا ہوگیا ہے۔ یہ ایسی کیوں ہوگئی ہے اور صابرہ کے دماغ میں تو جیسے بچھو کا ٹنے لگے تھے۔ بی بی فاطمہ کی یہ بیٹی اندھی اور دُکھیاری بیٹی کے تصوّر میں بھی یہ بات نہ آسکتی تھی کہ کسی جوان لڑکے سے کوئی جوان لڑکی گھر کی چار دیواری سے نکل کر ملنے جاسکتی ہے۔ خود

اس کی یہ حالت تھی کہ وہ منوّر سے آج تک ، ایک بات بھی نہ کہہ سکی تھی ۔ وہ خود جب تک اس سے بات نہ کرتا ۔ وہ اس سے بول بھی نہ سکتی ۔ اور اس سے بولتے اور بات کرتے وقت اب کئی دن سے کتنی لاج آتی ۔ پہلے تو اسے کچھ معلوم نہ تھا ۔ پہلے تو وہ جانتی نہ تھی کہ منوّر اور اس میں کیوں ایسا لگاؤ ہے مگر اب تو وہ سب کچھ جان گئی تھی اور اسے اس رالعہ نے کہہ دیا تھا " اری پگلی یہ منوّر تم سے محبت کرتا ہے ۔ یہ تم کو اپنی بیوی بنانا چاہتا ہے ۔ اور جب سے رالعہ نے اس سے یہ بات کہی تھی اس کا نقطۂ خیال ہی بدل گیا تھا ۔ اسے ایسا محسوس ہوا تھا جیسے منوّر کوئی ان ہونی سی بات چاہتا ہے ۔ مگر ہوتے ہوتے یہ ان ہونی سی بات اس کے دل کی دُنیا میں ایک عجیب نغمہ سا بن کر پھیلتی جا رہی تھی ۔ مگر اس ہر صورت کے باوجود وہ ایک قدم بھی چل کر منوّر کے پاس جانے کے لئے تیار نہ تھی ۔ اور ابھی پچھلی رات جب یہ منوّر کلہاڑی ہاتھ میں لے کر سرفراز کے گھر کی طرف بھاگا تو گو اس پر ہزاروں قیامتیں گزر گئیں ۔ گو اس پر اس لمحہ تک جب تک وہ واپس نہیں آ گیا ، جان کنی کی حالت طاری رہی ۔ گو ہر لمحہ موت اس کے حلق پر بیٹھی اسے ہزار ہزار جھٹکے دیتی رہی مگر ، اس نے زبان سے ایک لفظ نہیں کہا ۔ زہرہ سے یہ تک نہیں بولی کہ زہرہ کہیں منوّر کے دُشمن مارے نہ جائیں ۔

اور پھر جب منوّر وہاں سے واپس آ گیا اور رات کے پچھلے حصّہ میں اچانک اس کی چارپائی کے قریب بیٹھ کر اس کے ایک ہاتھ پر اپنی روتی اور بلکتی آنکھیں رکھ دیں ۔ تو اس وقت بھی وہ چپ رہی ۔ ایسی چُپ جیسے اس کے جسم سے جان ہی نکل گئی ہو ۔ وہ منوّر سے یہ تک نہ کہہ سکی :۔

" منوّر ! میں جانتی ہوں ، گو دیکھ نہیں سکتی کہ تم نے یہ ساری بہادری یہ ساری بڑائی محض اس لئے دکھائی ہے کہ تم مجھ سے محبت کرتے ہو ۔ مجھ اندھی ، مجھ بے کار اور مجھ سراسر

بوجھ لڑکی سے ، اور یہ تمہارا کتنا احسان ہے ۔ یہ تمہاری کتنی شرافت ہے اور منوّر۔ میرا دل تمہارے اس احسان پر کیسی خوشی محسوس کر رہا ہے ۔"

حالانکہ ، اس وقت جب منوّر نے اس کی ہتھیلی پر اپنی روتی آنکھیں رکھیں وہ خود بُری طرح رو پڑی تھی خود اس کی آنکھیں ، ہمہ تن آنسو بن گئی تھیں ۔ اور ——— یہ مریم کیسی انوکھی لڑکی ہے ۔ بالکل عجیب اور سمجھ میں نہ آنے والی لڑکی کہ ہر روز سرفراز سے اس کے مکان پر ملنے جاتی ہے اور ذرا نہیں شرماتی ۔ بھولی صابرہ سوچنے کو تو یہ ساری باتیں سوچ گئی مگر یہ نہ سوچا کہ اس میں اور مریم میں کتنا فرق ہے ۔ مریم ایک آزاد ماحول میں پلی ہے ۔ مریم کی ماں جاہل اور کم فہم عورت ہے ۔ اور اس کی ماں تو اپنی بستی ہی میں نہیں اپنے ضلع میں اپنے علم ، اپنی دانائی اور اپنی پارسائی کی وجہ سے اپنی مثال آپ تھی ۔

اور یہ مریم جس کے بارہ میں یہ اندھی صابرہ فکر کے گھوڑے دوڑا رہی تھی رابعہ کو مناکر اندر لے گئی تھی ۔

اور پھر دونوں زور زور سے قہقہے مار مار کر ہنسنے لگی تھیں اور صابرہ دم بخود تھی ۔

نواں باب

سرفراز کا زخم بھرتا جا رہا تھا۔ گورداسپور کا سول سرجن کئی دن سے اس کے بازو کو اصلی حالت پر لانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اور یہ کوشش بڑی حد تک کامیاب ہو گئی تھی شاہ جی بابا، صبح و شام، سرفراز کی مزاج پرسی کو ذیلدار کے پاس جاتے سرفراز کی پیشانی چومتے اور اس کے کان میں بہت ہولے سے کہتے :-

" بیٹا! تم نے ایک ایسی حرکت کی تھی جسے نہ میں اور نہ تیرا باپ اپنی زندگی میں کبھی برداشت کر سکتا تھا۔ تمہیں شاید نہیں معلوم ہم دونوں کو سائرہ کی ماں سے ایسی ہی عقیدت تھی جیسے سعادت مند بچوں کو اپنی ماؤں سے ہوتی ہے۔

سرفراز اس وقت تو آنکھیں جھکا لیتا کوئی جواب نہ دیتا مگر جب بی زبیدہ چنچل اور شوخ زبیدہ اس کے پاس بیٹھی ہوتی تو وہ اس سے ہنس کر پوچھتا :-

" اچھی زبیدہ! ہمارے باوا جان اور یہ بڈھے شاہ جی بھی کتنے احمق ہیں۔ سائرہ کی ماں کو اپنی ماں سمجھتے ہیں "

اور زبیدہ شوخی سے بات کاٹ لیتی " یعنی پھر سائرہ کی ماں ہماری دادی ہوئیں اور سائرہ بی ہماری پھوپھی ٹھہریں اور سچ مچ تم بھی بڑے احمق تھے جو پھوپھی جان سے عشق

رنے چلے ۔ سرفراز ہنس پڑتا اور زبیدہ فطری شوخی کے باعث ۔

یہ زبیدہ بھی ایک عجیب چیز تھی ۔ ہمیشہ اپنے آپ میں رہنے والی اور کسی قدر مغرور
ں کی خالہ کے لڑکے خالد اور خاور تو اسے ابھی تک سمجھ نہیں پائے تھے ۔ حالانکہ یہ پورے
سولہ سال ان کے ساتھ رہی تھی اور ان سولہ سالوں میں وہ دونوں یہ نہیں جان پائے تھے کہ یہ
ن میں سے کس ایک کو چاہتی ہے اور یا قطعاً نہیں چاہتی ۔

اس کی طبیعت بھی عجیب تھی ۔ ابھی ان دونوں سے ہنس رہی ہوتی، ابھی اپنے کمرہ سے
نکال دیتی ۔ اور وہ دونوں حیران رہ رہ جاتے ۔

سولہ سال کی یکجائی نے، زبیدہ کو اپنی خالہ کی بڑی لاڈلی بنا دیا تھا ۔ اور پھر اس کے
لاڈ پیار کا ایک سب سے بڑا سبب یہ بھی تھا کہ سرفراز کے بعد زبیدہ کی ماں کے ہاں متواتر
پانچ بچے پیدا ہوئے مگر کوئی بھی دو سال کا نہ ہو پاتا کہ موت کے دامن میں جا سوتا ۔ زبیدہ
ابھی ڈیڑھ سال کی تھی کہ زبیدہ کی خالہ برکت بی بی نے، اسے اپنی بہن سے مانگ لیا اور زبیدہ
ماں کی گود سے نکل کر خالہ کی گود میں پہنچی ۔ اور پھر اپنی ماں کو قریب قریب بھول ہی گئی ۔
رحمت، اس سے ملنے کے لئے، گورداسپور جاتی اور اس ڈر سے گھر نہیں لاتی کہ کہیں اس
گھر کا آسیب اسے اس سے چھین نہ لے ۔ ذیلدار صاحب بھی اپنی اس بچی کو دیکھنے کے لئے
ہر مہینہ وہاں جاتے اور اپنی اس بچی کو پلتے دیکھ کر خوش خوش گھر آجاتے ۔ اور زبیدہ کی خالہ
اسے بہت زیادہ چاہتی ۔ اس کی اپنی کوئی بیٹی نہ تھی ۔ صرف دو بیٹے تھے ۔ اور ان کی پیدائش
کے بعد اس کی کوکھ سوک گئی تھی ۔

خالہ کی محبت کے سایہ میں پل کر زبیدہ جوان ہونے لگی ۔ گو وہ سرفراز کے پاس نہیں
رہتی تھی مگر اسے اس سے بڑی محبت تھی اور جب بھی سرفراز اس سے ملنے جاتا ۔ وہ اس سے

بُری طرح لپٹ جاتی۔

سرفراز پر کلہاڑی کے حملہ کی خبر جب اچانک گورداسپور پہنچی تو زبیدہ ضبط نہ کر سکی۔ اور خالہ کی ہزار ممانعتوں کے باوجود بھائی کو دیکھنے یہاں آ گئی۔ اور اب یہاں سے لوٹنے کے لئے وہ کسی طرح تیار نہ تھی۔

اسے پہلے معلوم نہ تھا کہ یہاں اتنی دلچسپیاں ہوں گی۔ اس لئے ذہن میں سے یہاں کی ہر بات نکل گئی تھی۔ مگر یہاں آتے ہی اسے ایسے معلوم ہوا جیسے وہ جنت میں آ گئی ہے۔ اور پھر یہاں حویلی کے وسیع احاطہ میں کتنا اچھا میدان تھا گھوڑ دوڑ کے لئے۔ اور زبیدہ کو گھوڑے کی سواری کا شوق نہیں جنون تھا۔ اور شہر میں اسی جنون کے پورے ہونے کے مواقع بہت کم تھے۔ اور یہاں وہ جب چاہتی اپنے باپ کی سیاہ کوتل گھوڑی پر چڑھ سکتی تھی اسے یہاں آئے پندرہ دن ہو چکے تھے۔ پہلے ہفتے تو وہ بھائی کی پٹی سے لگی رہی لیکن دوسرے ہفتے کی پہلی صبح کو جیسے ہی وہ چہل قدمی کے لئے اپنی حویلی کے وسیع باغ میں پہنچی اور گھوڑ دوڑ کے دائرہ کو دیکھا، تو وہ بے اختیار ہو گئی اور اپنے باپ کی سیاہ کوتل گھوڑی پر کچھ اس طرح سوار ہوئی، کہ متواتر چار گھنٹے اسے بھائی کی بیماری تک یاد نہ رہی

شام کو پھر وہ اسی کوتل گھوڑی پر سوار تھی، اور اسے دوڑاتے دوڑاتے پاگل کر دیا تھا

اور پھر یہاں مریم تھی وہ اور یہ مریم ایک دوسرے کی سہیلیاں بن گئی تھیں اور نہ جانے کیا بات تھی۔ یہ زبیدہ، جو کسی لڑکی کو منہ نہ لگاتی تھی چند دنوں کے میل ملاپ ہی میں اس مریم کو بہت بُری طرح چاہنے لگی تھی۔ اور مریم بڑی دانا تھی وہ سرفراز پر جان دیتی تھی اور زبیدہ کو دیہاتی گیت سُنا سُنا کر اور اسے خوش رکھ رکھ کر اپنے اور سرفراز کے تعلقات کو گہرا کرنا چاہتی تھی۔

مگر نہ جانے کل سے ، اس زبیدہ میں ایک عجیب سی تبدیلی کیوں آگئی تھی ۔ اور اس کا ذہن ایک نئی الجھن میں کیوں پھنس گیا تھا ۔ اور وہ آپ ہی آپ اس منوّر کے بارہ میں کیوں سوچنے لگی تھی جس نے اس کے ۲۲ سال کے گبرو اور جسیم بھائی پر کلہاڑی سے حملہ کیا تھا ۔ اسے تو اس منوّر سے نفرت ہونی چاہئے تھی ۔ مگر اس کا دل ، خوشی سے نہیں ایک نامعلوم سی خواہش کی بنا پر اس منوّر کو دیکھنے کے لئے بے قرار رہنے لگا تھا ۔

اور گو مریم کل سے اسے بڑے شوخ شوخ گیت سُنا رہی تھی ، مگر زبیدہ کا ذہن برابر اُلجھتا چلا جا رہا تھا ۔ اور وہ سوچتی ہی جا رہی تھی ۔

" یہ منوّر کیسا ہوگا ، اس کے بازوؤں میں کتنی طاقت ہوگی ، اپنا یہ خیال ، وہ نہ تو اس مریم پر ظاہر کر سکتی تھی اور نہ بھائی سے پوچھ سکتی تھی ۔ وہ دونوں منوّر کے خلاف تھے ۔ ان سے وہ کیسے پوچھ لیتی کہ یہ منوّر کیسا ہے ۔

شاہ جی بابا صبح و شام آتے ، تو وہ ان کے قد و قامت اور موٹی موتی خوبصورت آنکھوں اور بلند پیشانی کو دیکھتی ۔ تو سوچتی شاہ جی بابا اس بڑھاپے میں اتنے اچھے لگتے ہیں تو یہ منوّر تو نہ جانے کتنا حسین ہوگا ۔

پگلی شاہ جی بابا کے قد و قامت اور لمبے لمبے ہاتھ پاؤں سے منوّر کے قد و قامت اور ہاتھ پاؤں کا اندازہ کرنے لگتی ۔ زبیدہ خود تو آرٹسٹ نہ تھی ۔ مگر اس کا ذوق ، یا سوچنے کی مشین آرٹسٹوں جیسی تھی ۔ اور اس زبیدہ نے اپنے دماغ میں منوّر کا ایک ایسا ہیولیٰ تیار کر لیا تھا جیسے میٹرک کے کورس میں پڑھائی جانے والی ایک کتاب میں ہرکولیس کی لفظی تصویر بنی تھی ۔ زبیدہ سوچتی یہ ہرکولیس بھی تو ہیرو تھا ۔ اس نے بھی تو اپنی محبوبہ کی خاطر ایک دیو قامت رقیب کے سینہ پر نیزہ سے وار کیا تھا ۔ اور ہرکولیس کو ایسا کرنے کی جرأت محض اس لئے ہوئی تھی

کہ اس کا اپنا جسم اس دیو سے کسی طرح کم نہ تھا۔

اور یہ منوّر جس نے اس کے جسم اور لمبے تڑنگے بھائی پر کلہاڑی چلائی ہے یقیناً اس کے بھائی جیسا لمبا تڑنگا اور گبرو جوان ہو گا۔

اور نہ جانے زبیدہ میں یہ کیا خاص بات تھی کہ وہ منوّر کے جسم کے بارے میں سوچتے وقت آپ ہی آپ شرمانے لگتی۔ اور کبھی کبھی یوں ہی سرفراز کے سامنے بیٹھی ہنس دیتی۔ اور سرفراز گاؤ تکیہ کے سہارے بیٹھے بیٹھے، اس شرماتی اور ہنستی بہن کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگتا اسے اپنی اس بہن سے کتنی محبت تھی۔ وہ دونوں ہی تو اس بڑے گھر کے چراغ تھے اور یہ چراغ جس کا نام زبیدہ تھا، ہنستے اور شرماتے وقت زہرہ تارے کی سی رعنائی اور دلفریبی پالیتا۔ اور سرفراز سوچتا، کتنا خوش نصیب ہوں میں، جو مجھے ایسی بہن میسر آئی ہے۔ لیکن وہ جانتا نہ تھا کہ اس کی یہ شرماتی اور مسکراتی بہن اس کے رقیب کے ذہنی تصوّر میں کھوئی شرما اور ہنس رہی ہے اور اگر وہ یہ بات جان لیتا تو شاید اپنی اس بہن کے منہ پر تھوک دیتا۔

اور زبیدہ مجبور تھی۔ وہ اس سال اٹھارہ برس کی ہو چکی تھی۔ اس کا قد لمبا، جسم بھرا، آنکھیں وحشی ہرنی جیسی اور بال بری عورتوں کی طرح لانبے لانبے اور کالے تھے۔ اور اس پوری بستی میں کوئی ایسا نہ تھا جو اس کی اس دولت، اس کے اس حسین سرمایہ اور اس جوانی محبت کی بارش کر سکتا۔ پوری بستی میں "مالکوں" کے تین ہی گھر تھے۔ ایک گھر تو خود اس کا اپنا تھا دوسرا گھر اس سائرہ، صابرہ اور زہرہ کا تھا جن میں سے ایک کی خاطر منوّر نے اس کے بھائی پر کلہاڑی چلائی تھی اور تیسرا گھر اس منوّر کا تھا، اور اس کے خیال میں یہ منوّر، غصیلہ، بلند ہمّت اور انتقام لینے والا منوّر، سائرہ کا تھا، نہ جانے کیا بات تھی زبیدہ منوّر کے حسین خیالی مجسّمے کی رعنائیوں پر غور کرتی، اچانک ایک جھٹکے کے ساتھ رک جاتی۔ اس کا ذہن بُری طرح جلنے لگتا

اور اسے دفعتاً ایسا محسوس ہوتا جیسے سائرہ نے دونوں بازو پھیلا کر اس کے ذہن سے اس کا یہ حسین مجسمہ چھین لیا ہے۔ ہنسی اس کے چہرہ سے غائب ہو جاتی اور اس کی جگہ ایک عجیب قسم کی سنجیدگی، ایک عجیب قسم کا روکھاپن اس کے حسین چہرہ پر چھا جاتا۔ اور جب سرفراز اس کے چہرہ کی اس اچانک تبدیلی کو دیکھتا تو اپنے دونوں بازو پھیلا کر، زبیدہ کی حسین گردن کو اپنی گرفت میں لے لیتا۔ اور اس کی مانگ میں بوسہ دیتے ہوئے پوچھتا :-

کیوں بی بی، یہ تم ہنستے ہنستے اس قدر سنجیدہ کیوں بن گئیں اور زبیدہ گھبرا جاتی۔ وہ کوئی جواب نہ دے پاتی اور تھوڑی دیر رک کر اپنی جگہ سے اٹھ جاتی۔ اور نہ جانے کیوں بھاگی بھاگی اپنے کمرہ میں پہنچتی، قدِ آدم آئینہ کے سامنے جا کھڑی ہوتی۔ اس کی لمبی لمبی قامت پریوں کو شرماتا چہرہ، موزوں پیشانی، صراحی دار گردن اور جوان سینہ، اسے اپنی طرف اس طرح گھورتا نظر آتا جیسے وہ حسن کا نام زبیدہ ہے، اس کی حریف ہے۔ اس کی دشمن اور اس کی قاتل ہے اور زبیدہ ایک بڑی سی چادر لے کر اس آئینہ پر ڈال دیتی اور اپنی حسین پیشانی پر اپنے گورے گورے ہاتھ رکھ کر کرسی پر دھم سے گر پڑتی۔

مگر آج جب کہ شاہ جی بابا، سرفراز کے لئے اپنے باغ میں سے لال مالٹوں کا ایک بہت بڑا ٹوکرہ لائے تھے اور بی زبیدہ سے ایک عجیب محبت کے ساتھ درخواست کی تھی :-

" میری بچی! اس ٹوکرے میں سے چند مالٹے نکال کر اپنے بھیا کو کاٹ کاٹ کر کھلا"

تو زبیدہ کا جی چاہا، وہ شاہ جی بابا کا دامن ہاتھ میں پکڑ کر ان سے کہے :-

" شاہ جی بابا! میں ایک عجیب ذہنی عذاب میں مبتلا ہو گئی ہوں۔ تمہارے گبرو بیٹے نے مجھے ایک عجیب خلش عطا فرما دی ہے۔ میں پردہ کرتی ہوں، بابا مجھے، گھر کی چار دیواری کے باہر جھانکنے نہیں دیتے۔ ذرا اپنے گبرو بیٹے سے کہیئے۔ ایک لحظہ کے لئے اس کھڑکی کے پاس

آن کھڑا ہو ، میں اسے ایک نظر دیکھنا چاہتی ہوں ‘‘

مگر یہ کتنی بے ہودہ خواہش تھی۔ گو وہ امیر لڑکی تھی ، ذیلدار کی بیٹی تھی ۔ مگر اس کا باپ بڑا مذہبی آدمی تھا۔ سخت قسم کا متعصب مذہبی بڈھا ۔ زبیدہ کی ماں رحمت گو ایک آزاد خیال گھرانے میں پلی تھی مگر جب سے وہ اس گاؤں میں آئی تھی ، زمیندار نے اسے گھر کی چار دیواری سے باہر جھانکنے نہیں دیا تھا ، اور یہی حال زبیدہ کا تھا ، یہ بات صحیح تھی کہ ان کے گھر کی چار دیواری ستره فرلانگ کے رقبہ میں پھیلی تھی ۔ اس میں کئی باغ تھے ۔ زنانہ الگ اور مردانہ الگ ۔ اس میں حوض بھی تھے اور گھوڑ سواری کے میدان بھی ۔ مگر اس کے چاروں طرف سات سات فٹ اونچی دیوار بنی تھی ۔ یہ گویا ایک قید خانہ تھا۔ رنگ و بُو سے لپٹا ہوا قید خانہ ۔ زبیدہ شاہ جی بابا سے اپنے دل کی یہ خواہش کیسے کہہ دیتی۔ وہ ان کی طرف مایوسانہ نظروں سے دیکھتی ہوئی اپنی جگہ سے اُٹھی اور ان کے حکم کی تعمیل میں مالٹے کی قاشیں کاٹ کاٹ کر سرفراز کے حلق میں ٹپکانے لگی اور سرفراز نے اپنی اس بہن کا یہ ہاتھ کئی بار چُوم چُوم لیا۔ اور زبیدہ نہ جانے کس تصور میں تھی کہ ہر بار شرما شرما گئی۔

یہ شام اس پر ایک قیامت تھی۔ اس کے جذبات کی دُنیا میں ایک طوفان مچا تھا اور جب وہ بھیا کے کمرہ میں سے باہر نکلی ، تو اس کو اپنی بینائی پر شبہ ہونے لگا ۔ اس کو ساری فضا اور فضا میں پھیلی ہر چیز اس کے اپنے دل کی طرح چیختی چلاّتی محسوس ہوئی ۔ اور اس نے انتہائی اضطراب میں سر کو بہت زور کے ساتھ دیوار کے ساتھ دے مارا ۔

اچانک بی مریم نے اندر جھانکا اور زبیدہ کو اس حال میں دیکھ کر ٹھٹھک کر رہ گئی ۔ زبیدہ نے اسے اور اس نے زبیدہ کو دیکھا ، اور نہ جانے اس زبیدہ کو کیا ہوا ، وہ بجلی کی سی تیزی کے ساتھ دو قدم آگے بڑھی اور اپنے دونوں بازو اس کی طرف پھیلا دیئے ۔ اور مریم ان جوان ، گداز اور حسین بازوؤں میں اس طرح آن دبکی جیسے یہ سرفراز کے بازو ہیں۔

اور جب زبیدہ نے اسے چھوڑ دیا تو مریم کو ایسا محسوس ہوا جیسے سرفراز نے اس کے جذبات کو بھڑکا کر، اسے اپنے جسم سے الگ کر دیا ہو۔ اب وہ دونوں آمنے سامنے بیٹھی تھیں۔ دونوں جوان تھیں۔ دونوں کے جذبات بیدار تھے اور خواہشات منہ زور ندی کی طرح شور مچا مچا کر ان کے دلوں کی زمین پر اپنا سر پٹخ رہی تھیں۔ دونوں کی بیماری ایک تھی۔ مریم کو سرفراز نے کسی دوسرے جوان جسم کے قرب کی لذتوں سے آشنا کر کے کئی دن سے آوارہ و سرگرداں چھوڑ رکھا تھا اور زبیدہ گو کسی مرد کے جوان جسم سے مس نہ ہوئی تھی مگر ذہن ہی ذہن میں ایسی لذت چکھ چکی تھی اور ابھی تھوڑی دیر پہلے، اس نے نہ جانے کس خیال سے اس جوان مریم کو جو اپنے سینہ سے لپٹا لیا تھا اور اس لپٹانے سے اس کے جوان سینے نے دب کر جو لذت پائی تھی وہ ابھی تازہ تھی

ان دونوں نے کئی بار ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ آنکھوں ہی آنکھوں میں ہنسیں۔ اور نہ جانے کیسے پھر ان دونوں کو کیا ہوا، آیا ان دونوں کو ایک ہی وقت میں کسی بجلی نے چھو لیا تھا کہ وہ اپنی جگہ سے اٹھیں اور ایک دوسری سے پھر لپٹ گئیں۔ مریم تجربہ کار تھی۔ اس نے سرفراز سے بہت کچھ سیکھا تھا۔ اور جو کچھ سیکھا تھا اس نے ایک ہی شام میں اس زبیدہ کو سکھا دیا اور زبیدہ کو ایسا محسوس ہوا جیسے وہ کسی نئے مدرسہ میں داخل ہوئی ہے۔ ایسے مدرسہ میں جہاں کی زمین بھی نئی ہے اور آسمان بھی نیا۔

اس شام، زبیدہ نے وہیں اپنے کمرہ میں کھانا کھایا۔ اور نہ صرف کھایا بلکہ مریم کو بھی کھلایا۔ ان دونوں نے ایک دوسرے کے منہ میں لقمے ڈالے اور جب خوب کھا چکیں تو ایک دوسرے کے گلے میں باہیں ڈال کر، کبھی ناچیں کبھی بیٹھیں، کبھی اٹھیں اور کبھی لیٹ گئیں۔ اور کبھی صحن باغ میں نکل کر ایک دوسری کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے اٹھکیلیاں کرتی پھریں۔

آج رات مریم یہیں رہی اور بی رحیمن کو پیغام بھیج دیا گیا۔ "بی مریم آج رات

بی بی جی زبیدہ کے پاس رہیں گی ۔" اور بی رحمین کے لئے یہ بڑی خوش قسمتی کی بات تھی کہ ذیلدار کی بیٹی ، اس غریب کی بیٹی کو اپنے ہاں سلائے گی ۔

باہر چاندنی چٹکی تھی اور چاندنی کی لہریں زبیدہ کے کمرہ کی دائیں کھڑکی پر لپٹی بیل میں سے چھنتی ان دونوں کے بالوں سے کھیل رہی تھیں اور وہ دونوں آج اتنی خوش تھیں جیسے ان کے دلوں پر کے آسمان پر چھائے بادل اچانک چھُپ گئے ہوں ۔

زبیدہ شاید ، آج کی رات خوب شرماتی ، خوب لجاتی ، مگر مریم نے ہر بار اسے اپنے سے لپٹا لپٹا لیا ۔ اس کی آنکھیں ، اس کے گال ، اس کی پیشانی ، اس کی گردن —— اور اس کا گداز سینہ چوم چوم لیا ۔

چاندنی بیل کی پتیوں سے کھیلتی رہی اور وہ دونوں ایک دوسرے کے چہرے اور سینہ سے جی بہلاتی رہیں ۔

اور یہ چاندنی رات شاید سکڑ گئی تھی کہ جب زبیدہ کے گھر کی چار دیواری میں بنی ہُوئی مسجد کے مینار سے موذن کی اذان گونجی تو دونوں ابھی تک ایک دوسری سے لپٹی تھیں اور نیند کی دیوی ان کے سروں کے قریب کھڑی شرما رہی تھی ۔

اچانک ذیلدار جی کی گرجدار آواز فضا میں گونجی انہوں نے زبیدہ کو نماز کے لئے پکارا تھا زبیدہ کانپ کر اُٹھ بیٹھی اور اسے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ ایک حسین مگر زہریلے خواب سے جاگ گئی ہو ۔

اس نے کپڑے پہن لئے باہر کی طرف بھاگی ۔ وضو کرنے لگی ۔ اور جب نماز کے لئے مصلیٰ پر کھڑی ہوئی تو اس کا جسم بُری طرح تھکا تھا ۔ اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے کسی نے اس کے بند بند ، جوڑ جوڑ کو جھنجھوڑ ڈالا ہے اور ہڈیوں کا گودہ نکال کر باہر پھینک دیا ہے ۔

یہ کیسی بُری کیفیت تھی، یہ کیسا زہر تھا، جو اس کے جسم میں سرائت کر گیا تھا۔

اس نے بڑی بے دلی کے ساتھ نماز پڑھی۔ نیند کے باعث اس کا دماغ بُری طرح دُکھنے لگا تھا۔ وہ مصلیٰ سے اُٹھی اور چارپائی پر آن گری۔ مریم ابھی تک جاگ رہی تھی اور جب زبیدہ اس کے ساتھ لیٹ گئی تو مریم نے اسے پھر اپنے شکنجے میں کسنا چاہا۔ مگر زبیدہ کو اس مریم سے کراہت پیدا ہو گئی تھی۔ اس نے اس کے دونوں ہاتھ بُری طرح جھٹک دیئے۔ اور کسی قدر نفرت بھری آواز میں کہنے لگی :۔

مجھے نیند آ رہی ہے۔ تم دُوسری طرف مُنہ کر کے سو جاؤ۔

اور مریم سوچنے لگی " کیسی مطلبی ہے یہ امیر لڑکی "

اور یہ لڑکی مطلبی نہ تھی۔ وہ تو جوانی کے پل صراط پر سے گزر رہی تھی اور یہ پل صراط حشر کے روایتی پل صراط کی طرح تلوار سے زیادہ تیز اور بال سے زیادہ باریک تھا۔

اور دُوسری شام جب پھر یہی مریم اپنے مسکراتے ہونٹوں اور پھیلے پھیلے بازوؤں کے ساتھ زبیدہ کے کمرے میں داخل ہوئی تو زبیدہ وہاں نہ تھی۔ وہ اس پل صراط سے گزر کر صحیح سلامت پھر عالمِ برزخ میں پہنچ چکی تھی۔ اور اس کا ذہنی محبوب منوّر، پھر اس کے ذہن پر مسلّط ہو چکا تھا۔ وہ جانتی تھی مریم آج پھر آئے گی۔ وہ آنے کا وعدہ کر کے گئی ہے۔ اس لئے وہ اس کے آنے سے بہت پہلے سواری کا لباس پہن کر اپنی سیاہ کوتل گھوڑی پر سوار ہو کر اسے دیوانہ وار گھوڑ دوڑ کے میدان میں دوڑا رہی تھی۔ اس کے لمبے لمبے سیاہ بال جو اس کی پشت پر بکھرے پڑے تھے اور ہوا میں اس طرح اُڑ رہے تھے جیسے اس کی پیٹھ اور گردن کے آس پاس کسی جادوگر مکڑی نے ایک عجیب جالا بن دیا ہو۔ اور اس کا جوان سینہ اُوپر اُٹھ اُٹھ کر اس زور سے بیٹھ رہا تھا جیسے زبیدہ اس کمینہ کو سزا دے رہی ہے۔ اور اس کا دماغ کچھ

عجیب قسم کے خیالات میں اُلجھا تھا۔ وہ کچھ دیوانی سی ہو گئی تھی اور اس عالمِ دیوانگی میں سوچ رہی تھی
رات کو کیسی ذلیل اور کیسی کمینی حرکت کی اس نے، اور اچانک یہ سوچتے سوچتے،
اسے موتی مریم کی رات کی حرکتیں یاد آگئیں اور اس کا جی چاہا وہ گھوڑے سمیت اس بوڑھے
درخت سے ٹکرا جائے جو کوئی دو سو سال سے ان کے مکان کی چار دیواری میں کھڑا اس کے
خاندان کی جوان لڑکیوں کے جذبات اور دیوانگی کا تماشہ کر رہا ہے۔ مگر بوڑھے درخت
کے ساتھ سر پھوڑنا آسان بات نہ تھی۔ زبیدہ کی گھوڑی اس کے قریب پہنچتی اور آپ ہی
آپ مڑ کر پھر اس گول سی سڑک پر بھاگنے لگتی جس کا دائرہ غیر فانی تھا اور جو اس طرح
گھومتا گھومتا نہ جانے کتنی ازلی اور ابدی چیز بن گیا تھا۔

ہر طرف دھندلکا ہی دھندلکا تھا۔ اور یہ دھندلکا ہولے ہولے رات کی سیاہی میں
تبدیل ہوتا گیا، مگر زبیدہ ابھی تک گھوڑی پر سوار اس دائرہ کی وسعتوں کو ختم کرنے کی ناکام
کوشش کر رہی تھی۔ ادھر مریم زبیدہ کا انتظار کرتے کرتے تھک گئی تو باغ کی طرف آئی
باغ کے وسط میں لگی بڑی بتی اپنی لال لال روشنی ایک خاص فاصلے اور دائرہ میں پھیلائے تھی
مریم اس کے نیچے آن کھڑی ہوئی اور زبیدہ کو زور زور کے ساتھ پکارا۔

مگر زبیدہ نے اس کی آواز نہ سُنی۔ وہ تو پریشانی کے ایک ایسے عالم میں تھی جہاں
کان سماعت سے محروم ہو جاتے ہیں۔ مگر مریم تو بیدار تھی اور اس کا جسم تو مالش کے لئے بیتاب
تھا۔ اس لئے اُچھلتی کودتی آگے بڑھی اور اس دائرہ کے بیچ میں آن کھڑی ہوئی، جہاں
زبیدہ کی گھوڑی دیوانہ وار دوڑ رہی تھی۔

مریم کی نگاہیں دُور سے اپنی طرف بھاگتی آتی گھوڑی اور زبیدہ پر جمی تھیں۔ رات کی
تاریکی میں یہ زبیدہ اور اس کی گھوڑی کیا ڈراؤنی صُورت اختیار کر گئی تھیں کہ جیسے ہی یہ

دونوں قریب آئیں مریم بُری طرح کانپ کر راہ میں سے ہٹ گئی۔ اس نے زبیدہ کو کئی بار آواز دی مگر زبیدہ نے اس کی آواز کو سُننے کی ضرورت محسوس نہیں کی اور ہوا کے ایک تیز جھونکے کی طرح اس کے پاس سے گزر کر پھر تاریکی میں غائب ہوگئی۔ اور مریم کا سارا جسم ایک عجیب قسم کی مایوسی کی آگ میں تپنے لگا۔ اور وہ جیسے آئی تھی ویسے ہی پلٹ گئی اور باغ ہی کے رستہ گھر کو سدھاری۔

مگر زبیدہ ابھی تک گھوڑی دوڑا رہی تھی۔ نہ جانے اچانک اس کے دل کے اندر ایک عجیب خواہش کیوں جاگ اُٹھی۔ اور اس کا جی چاہا بہادر سواروں کی طرح وہ بھی اپنی گھوڑی کو سات فٹ اُونچی دیوار کے پھاندنے میں آزمائے۔ اور یہ خیال جس تیزی سے اس کے دماغ میں آیا اسی تیزی کے ساتھ اس نے گھوڑی کا رُخ دیوار کی طرف پھیر دیا۔ گھوڑی بھاگتے بھاگتے خود دیوانی ہوگئی تھی۔ اس کے حواس خود اپنی جگہ پر نہ تھے اور اسی دیوانگی میں اس نے ایک ایسی جست بھری کہ دیوار کو پھاند گئی۔

اب زبیدہ گھر کے حصار سے باہر تھی اور وہ اور اس کی گھوڑی کھلی فضا میں پرواز کر رہی تھیں۔ یہ ایک صاف سی سڑک تھی جو بستی کے گرد گھومتی ہوئی پہاڑی کے اُوپر چڑھ گئی تھی۔ اندھیری رات کے دامن میں ایک سیاہ سا سایہ برق کی رفتار کے ساتھ بستی کے اردگرد پھیلا اس سڑک پر بھاگا جا رہا تھا۔

بستی کی حد ختم ہوگئی، اب سڑک ذرا ذرا اُوپر کو اُٹھی تھی۔ اور اس اُوپر اُوپر کو اُٹھی سڑک کے بیچ میں دو بیل ایک دوسرے کے ساتھ لگے اور گردنوں میں پڑے ہوئے جوئے میں بندھے بستی کی طرف خراماں خراماں چلے آ رہے تھے۔

ان بیلوں اور زبیدہ کی گھوڑی کے مابین صرف دس قدم کا فاصلہ رہ گیا تھا اور یہ

فاصلہ ایک آن میں ختم ہوا۔ گھوڑی زبیدہ سمیت ان بیلوں سے کچھ اس طرح جا ٹکرائی کہ بیل اور گھوڑی تو ایک دوسرے میں شاید جذب ہو گئے مگر زبیدہ برق کے سے ایک جھٹکے کے ساتھ گھوڑی کی پشت پر سے اُڑی اور گڈھے میں جا گری جو سڑک کی داہنی طرف گھنی جھاڑیوں سے بھرا پڑا تھا۔

دیوانگی کی جگہ خوف و ہراس نے لے لی اور آپ ہی آپ ایک عجیب قسم کی چیخ اس کے ہونٹوں سے نکل گئی۔ اور اس نوجوان کے کانوں سے جا ٹکرائی جو لالٹین ہاتھ میں لئے پہاڑ کی چوٹی سے نیچے کی طرف اُتر رہا تھا۔ جیسے ہی یہ نسوانی آواز اس کے کانوں میں پہنچی۔ اس کے پاؤں کو جیسے بجلی چھو گئی اور وہ بڑی تیزی کے ساتھ اس سمت اُٹھنے لگے۔

اور جب وہ ان بیلوں کے قریب آیا، جنہیں خراماں چلتے چھوڑ کر وہ اپنی صابرہ کے لئے رات کی رانی کے پھول چننے کے لئے پیچھے رہ گیا تھا۔ تو وہ لالٹین ہاتھ میں لئے اس طرح دم بخود کھڑا ہو گیا جیسے ایک خوفناک زلزلے نے اس پہاڑ کو ہلانا شروع کر دیا ہے جس سے وہ نیچے کی طرف اُتر رہا تھا۔

دونوں بیل اور ایک سیاہ گھوڑی ایک دوسرے سے تھوڑے تھوڑے فاصلے پر گرے پڑے تھے۔ بیلوں کے سینگ ٹوٹ گئے تھے۔ سروں سے خون بہہ رہا تھا اور گھوڑی کی دونوں آنکھیں پھوٹ چکی تھیں اور گردن تو شاید جسم سے الگ ہو گئی تھی۔

اس کے ہاتھ میں پکڑی ہوئی لالٹین ان تینوں کے زخمی اور خون آلودہ جسموں پر روشنی ڈال رہی تھی اور وہ پہلے سے زیادہ حیرت کے ساتھ یہ انوکھا منظر دیکھ رہا تھا کہ جھاڑیوں میں اُلجھی زبیدہ کی آواز ایک بار پھر چیخی۔ اور منوّر کا جسم اس طرح کانپا جیسے زلزلے کے جھٹکے اس کے جسم میں سرائت کر گئے ہیں مگر وہ بہت جلد سنبھلا اور لالٹین ہاتھ میں لئے، اس طرف

آیا جہاں سے چیخنے کی آواز آرہی تھی۔

ایک عجیب منظر اس کے سامنے تھا۔ ایک جوان اور انتہائی رعنا عورت اپنے پھٹے چیتھڑے لباس اور خون بہاتے جسم کے ساتھ جھاڑیوں میں پھنسی مچھلی کی طرح تڑپ رہی تھی۔ منوّر نے اسے دیکھا چند ساعتوں کے لئے اس کی آنکھیں بار بار جھپکیں۔ مگر اس نے بہت تیزی کے ساتھ لالٹین زمین پر رکھ دی۔ اور اس عورت پر اس طرح جھپٹا جیسے بھوکا بھیڑیا شکار پر جھپٹتا ہے۔ اس نے جھاڑیوں کے کانٹوں کی پروا نہیں کی۔ وہ ان میں گھسا اور اپنے بازو اس عورت کے گرد اس تیزی کے ساتھ پھیلائے کہ دوسرے لمحے اٹھارہ سال کی یہ جوان اور تر و تازہ زبیدہ اس کی گود میں تھی اور وہ اسے اپنے جسم کے ساتھ اس طرح لگائے تھا جیسے مرغی اپنے چوزوں کو اپنے پروں تلے چھپا لیتی ہے۔ اور اس زبیدہ کی لمبی لمبی زلفیں جو بری طرح الجھ گئی تھیں اس کے شانوں پر بکھری تھیں۔ اور اس کی پھٹی ہوئی قمیص میں سے اس کی صراحی دار گردن اور آدھا سینہ زخمی اور خون بہاتا سینہ منوّر کے سینہ سے لگا تھا۔ زبیدہ ہوش میں نہ تھی۔ اگر ہوش میں ہوتی تو شاید اس بے بسی اور اس عریانی سے پیدا ہونے والی کیفیت کو سوچ کر اپنا گلا اسی وقت گھونٹ لیتی۔

منوّر کی زندگی کا یہ پہلا انتہائی انوکھا اور انتہائی خوفناک حادثہ تھا کبھی کوئی جوان عورت اس عالم میں اس کے بازوؤں میں سمٹی نہ تھی۔ اور اس جوان عورت کو اپنی گود میں بھرے ہوئے پاکر تو اسے ایسا محسوس ہونے لگا تھا جیسے اس کے بازو بہت چھوٹے اور اس کا قد بہت ٹھگنا ہے۔ حالانکہ اس عورت کا سر اس کے کندھے پر رکھا تھا مگر پاؤں زمین پر گھسٹ رہے تھے۔

اس عالم میں وہ اسے سڑک پر لایا اور بیچ سڑک اسے لٹا دیا۔ اپنی کمر سے

بندھی ہوئی کھدر کی چادر کھولی اسے پھیلایا اور اس طرح جیسے ماں اپنی کسی بے ہوش ننگی بچی کا ننگ ڈھکتی ہے اس نے اس زبیدہ کے جسم کے چاروں طرف یہ چادر لپیٹ دی۔

یہ غنیمت تھا کہ لالٹین ابھی وہیں رکھی تھی اور اس کی روشنی پوری طرح ان پر نہیں پڑ رہی تھی ورنہ شاید اس کا دماغ اس خوفناک طوفان میں ابھی تک مبتلا تھا جسے اس کی نظروں نے چند لمحے پیشتر دیکھا تھا۔

اور اب جب کہ لالٹین دُور تھی وہ اس زبیدہ کے قریب دو زانو ہو کر بیٹھ گیا۔ اور اس کے آدھے جسم کو سر اور سینہ سمیت اپنی رانوں پر رکھ لیا۔ اور اپنے کھردرے اور کسی قدر زخمی ہاتھوں سے اس زبیدہ کے چہرے اور پیشانی کی خراشوں سے بہنے والے خون کے قطروں کو صاف کرنے لگا۔

زبیدہ کا مجروح سینہ بے ہوشی ہی کے عالم میں بہت تیزی کے ساتھ اُٹھ اٹھ کر نیچے کو گر رہا تھا۔ اس کی سانس شاید حلق میں اٹک اٹک رہی تھی اور یہ اٹکی اٹکی سانس کھانسی میں تبدیل ہو گئی۔ زبیدہ ایک بار نہیں متواتر سات بار کھانسی اور ہر بار منوّر کی رانوں پر رکھی ہوئی یہ زبیدہ منوّر کے سینہ سے لگ لگ گئی۔ سحر تھا یا طوفان، قیامت تھی یا حشر جسے اس منوّر نے اپنے اُوپر طاری محسوس کیا۔ اور خود اس بے ہوش زبیدہ کے حواس بجلی کی کسی نامعلوم رَو کے متواتر جھٹکوں سے اپنی جگہ پر آ گئے تھے۔ اس کی آنکھیں کھل گئی تھیں اور اسے ایسا محسوس ہونے لگا تھا جیسے وہ کسی عجیب غریب اور انتہائی خوبصورت اور گبرو ہیرو کی گود میں سر رکھے لیٹی پڑی ہے۔ یہ حواس کے جاگ جانے پر پیدا ہونے والی پہلی کیفیت تھی اور دُوسری کیفیت اس وقت پیدا ہوئی جب منوّر کے کھردرے ہاتھ پھر اس کے چہرہ اور پیشانی کے خون کے قطرے صاف کرنے لگے۔

بہ ملس کیا تھا، یہ کیفیت کیسی تھی کہ زبیدہ کی موٹی موٹی خوبصورت آنکھیں بُری طرح بہہ نکلیں۔ اور وہ بُری طرح سسکیاں بھرنے اور اپنے بال نوچنے لگی۔

اور منوّر دم بہ خود اس کا یہ عالم دیکھا کیا۔

اچانک دُور سے کئی ایک لالٹینیں ایک جلوس کی صورت میں اس طرف بڑھتی دکھائی دیں۔ یہ لالٹینیں بھاگ رہی تھیں اور بھاگ کر اس طرف آ رہی تھیں جہاں یہ حادثہ ہوا تھا۔

اور یہ لالٹینیں سر پر آن بھی پہنچیں مگر منوّر نے اپنی گود سے اس حسین زبیدہ کو اتار کر زمین پر رکھنے کی ضرورت نہ سمجھی اور حتیٰ کہ اس کا ایک ہاتھ اب تک زبیدہ کے چہرہ اور پیشانی پر سے خون کے قطرے صاف کر رہا تھا۔ اور لالٹینوں والے لوگوں میں سے کئی تو وہ تھے جنہوں نے اس رات کا منظر بھی دیکھا تھا جب اس منوّر نے سرفراز پر کلہاڑی کا وار کیا تھا اور اب یہ بھی دیکھ رہے تھے۔ ان کی آنکھیں کئی بار جھپکیں کئی بار شعلوں کی طرح سرخ ہوگئیں مگر کسی کو آگے بڑھنے کی ہمّت نہ ہوئی۔ انہیں تو خیر کیا ہمّت ہوتی، خود جناب ذیلدار صاحب، بوڑھے اور جہاندیدہ ذیلدار صاحب دم بہ خود کھڑے تھے۔

یہ منظر تو ان کے ہوش و حواس کی دیواریں اور حصار توڑ کر ان کے دل و دماغ اور دل اور دماغ کی ہر قوت پر چھا گیا تھا۔ اس بڑھاپے میں انہیں ایسے منظر دیکھنے کی ہمّت نہ تھی۔

البتہ منوّر اب اپنے حواس میں آ چکا تھا۔ اس نے اپنا ایک ہاتھ ذیلدار صاحب کی طرف پھیلا دیا اور ذیلدار صاحب اس طرح جیسے وہ مشین تھے اس ہاتھ کی طرف بڑھے۔ منوّر نے اپنے اس ہاتھ کی مدد سے انہیں زمین پر اپنی ہی طرح بٹھا دیا اور زبیدہ کو اپنی گود سے سرکا کر ان کی گود میں ڈال دیا۔

اور اس حرکت سے جیسے زبیدہ کے زخم چھل گئے۔ وہ بُری طرح چیخ اُٹھی، اور

بوڑھے ذیلدار نے روتی روتی آنکھوں اور دل کے ساتھ اپنی اس جوان بچّی کو جسے وہ ستاروں کی آنکھ سے بھی چھپانا چاہتا تھا اور جسے اب یہ انوکھا اور عریاں حادثہ پیش آیا تھا، اپنے سینہ کے ساتھ لگا لیا۔ اور ایسا کرتے وقت زبیدہ کے سینہ کو ڈھانکنے والی چادر کا ایک کونہ ذرا سرک گیا اور بوڑھے ذیلدار کی کانپتی آنکھوں نے دیکھا، بچّی کا سارا سینہ لہولہان اور بالکل عریاں تھا

ذیلدار کو ایسے محسوس ہوا جیسے اچانک اس کی ماں زندہ ہو کر اس کے دیکھتے دیکھتے سارے عالم کے سامنے ننگی ہو گئی ہے۔

وہ بڑا غیرت مند، بڑا پرہیزگار اور بڑا انوکھا آدمی تھا۔ اور اس انوکھے آدمی کے دل پر یہ ایک ایسی بڑی چوٹ پڑی تھی کہ وہ اس کو برداشت نہ کر سکا۔ اور نہ جانے کیسے اس کے دل نے بہت تیزی کے ساتھ دھڑکنا شروع کر دیا۔ اس نے اپنی اس بچّی کو اور زیادہ بیتابا کے ساتھ اس دھڑکتے دل کے قریب کر لیا۔ مگر دل دھڑکنے نہیں تڑپنے تڑپنے نہیں اُچھلنا لگا تھا۔ اور یہ اُچھلتا اور تڑپتا دل دفعتاً بیٹھ گیا۔ اس کے ہاتھوں کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی اور زبیدہ اس کے سینہ سے اس کی رانوں پر سرک گئی اور اس بڈھے کا اپنا سر جھک کر اس کے سینہ آن گرا۔

ساری کی ساری لالٹینیں شاید بہت تیزی سے بھڑک اُٹھی تھیں۔ یا ان کو سنبھالنے والے ہاتھ کانپ گئے تھے۔ منوّر یہ تمیز نہ کر سکا۔ خود اس کے دماغ اور دل کے کسی انوکھے کیل سے لٹکی لالٹین اس بُری طرح بھڑک اُٹھی تھی کہ وہ اپنے جسم کا توازن برقرار نہ رکھ سکا۔ اور جہاں کھڑا تھا وہیں بیٹھ گیا۔ مگر جیسے اس کے دل اور دماغ کی یہ لالٹین پھر متوازی روشنی پھینکنے لگی ہو وہ جیسے بیٹھا تھا ویسے ہی اُٹھ کھڑا ہوا۔ اور ان دونوں باپ بیٹی پر جھک گیا۔ اس نے اپنے ہاتھ دونوں پر پھیلا دیئے اور مردوں کی سی آواز میں نہیں بچّوں کی سی حیرانی اور غم کے ساتھ چیخا۔

"اے لوگو! جو پاس کھڑے ہو تمہارے ہاتھ کیوں نہیں کانپتے، تمہارے جسم منجمد کیوں ہو گئے ہیں، تمہاری آوازیں سوک کیوں گئی ہیں، تم چیختے اور چلاتے کیوں نہیں؟ ذیلدار صاحب مر گئے ہیں۔

اور ساری لالٹینیں زمین پر گر پڑیں۔ کوئی اوندھے منہ اور کوئی سیدھے اور یہ سارے بیت چیخ بھی اُٹھے اور منوّر کی مدد کو بھی بڑھے۔ مگر ان میں سے کوئی ذیلدار کی جوان اور رعنائی اندر رعنائی مجروح بیٹی کے جسم پر انگلی نہ رکھ سکا۔ ان سب نے ذیلدار کو سنبھالا اور یہ متاعِ گراں بہا اور سرمایہ بخت رسا پھر منوّر کی گود میں آ رہا۔

منوّر کے الفاظ بجلی کی نوکیلی نوکوں سے زیادہ تیزی کے ساتھ اس زبیدہ کے دماغ اور دل میں چبھ گئے تھے۔ اور وہ ہوش و حواس سے پھر بیگانہ ہو چکی تھی۔

لوگوں نے ذیلدار کی نعش اُٹھائی اور منوّر نے زبیدہ کو گود میں بھرا۔ اس کی عمر ہی کیا تھی۔ اور اس عمر کے لئے یہ بوجھ کتنا زیادہ تھا۔ مگر اس منوّر کے جسم میں نہ جانے کتنی توانائی اور کتنی طاقت بھر گئی تھی کہ زبیدہ کا بوجھ اسے رات کی رانی کے پھولوں کے اس گلدستے جتنا محسوس ہوا جسے وہ ابھی تھوڑی دیر پہلے جنگل سے توڑ کر گھر لے جا رہا تھا۔ بستی آ گئی تھی اور وہ سب بستی کی گول سڑک پر سے ہوتے ذیلدار کی حویلی کی طرف بڑھ رہے تھے۔

نہ جانے یہ ماتمی جلوس جس کی زبانوں پر ابھی تھوڑی دیر پہلے "نالے لگے تھے۔ اب دفعتاً" نالہ کیوں بن گیا تھا۔

بستی کے سارے دروازے کھلتے جا رہے تھے اور ان میں سے مرد اور عورتیں، بچے اور بوڑھے باہر نکل نکل کر اس جلوس میں ملتے جاتے۔ منوّر کا اپنا گھر، سائرہ، صابرہ اور زہرہ کا گھر بھی آ گیا۔ مگر منوّر کے پاؤں رُکے نہیں۔ سائرہ، صابرہ اور زہرہ لالٹین ہاتھ میں لے کر

باہر کے دروازہ پر آن کھڑی ہوئی تھیں اور لہو لہان منور جوان زبیدہ کو گود میں اُٹھائے بہت تیز تیز آگے کی طرف بھاگا جارہا تھا۔ اور پیچھے سارا رونا کارواں تھا۔

منور سب سے پہلے حویلی میں داخل ہوا۔ اور اس کے پاؤں آپ ہی آپ مردانہ کی طرف نہیں زنانہ کی طرف اُٹھے۔

ذیلدارنی، سرفراز، اور دُوسری تمام نوکرانیاں روتی روتی صحن میں آ گئی تھیں۔ ان سب کی توجہ ذیلدار کے جلوس کی طرف تھی۔ وہ سب ذیلدار کی نعش کو، برآمدہ میں بچھی ایک چارپائی پر لٹائے اس کے چاروں طرف کھڑے رو رہے تھے۔ اچانک شاہ جی بابا بھاگے بھاگے اندر آئے۔ پہلے کہرام کو چیر کر ذیلدار کو دیکھا، اس کی پیشانی چومی اور پھر اس حصار کو توڑ کر اس طرف بڑھے جہاں منور بے ہوش زبیدہ کو گود میں لئے ابھی تک کھڑا تھا۔

انہوں نے منور کے بازو چیر ڈالے اور زبیدہ کو اس میں سے نکال کر اپنی گود میں بھر لیا اور اس طرح جیسے وہ شیرِ غرّاں تھے چیخے:۔

"اے اندھی رحمت بی بی تو کہاں ہے۔ بڈھے کی نعش پر رو رہی ہے اور یہ جو تیری غیرت کی نعش ہے اس کی طرف کوئی توجہ نہیں کرتی۔"

رحمت بی بی اور کئی دُوسری عورتیں اس طرف لپکیں اور شاہ جی بابا ان کے آگے آگے بڑھتے اندر آئے۔

اور ادھر نہ جانے سرفراز کو کیا ہوا۔ اسے ابھی تک حقیقت کا کوئی علم نہ تھا۔ وہ باپ کی نعش پر سے اُٹھا، حصار کو توڑ کر باہر آیا اور منور کو لہولہان دیکھ کر نہ جانے کیا سمجھا۔ اسے اپنے بازوؤں میں بھرا اور ایک ساعت کے اندر اسے ہوا میں اچھال کر اپنے بازو کھینچ لئے اور منور، کئی لوٹنیاں کھاتا دُور زمین پر جا گرا اور جیسے گرا تھا ویسے ہی پڑا رہا

کسی نے اس کی طرف نہیں دیکھا۔ البتہ شاہ جی بابا کی آنکھ برآمدہ میں سے نکلتے وقت اس پر پڑ گئی تھی۔ انہوں نے سرفراز سے کچھ نہیں کہا۔ منوّر کی طرف لپکے اور اسے ٹھوکریں مار مار کر ادھ موا کر دیا۔ اور شاید وہ اسے جان ہی سے مار دیتے۔ اگر خدا بخش ان کی طرف بہت تیزی سے لپک کر ان کو پیچھے نہ ہٹا لیتا۔

شاہ جی کے بوڑھے جسم میں نہ جانے کہاں کی توانائی آ گئی تھی کہ خدا بخش کے بازوؤں کے حصار کو ایک لمحہ میں توڑ ڈالا۔ اور منوّر کی طرف پھر لپکے۔ مگر خدا بخش نے انہیں پھر اپنی طرف کھینچ لیا اور بری طرح چیخا

" شاہ جی بابا! ہوش کیجئے۔ اس غریب کا کیا دوش ہے۔ یہ تو قدرتی بات تھی اور یہ تو اس بچے کی مردانگی تھی کہ بی بی جی مرنے سے بچ گئیں۔ آپ وہاں نہ تھے۔ مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بی بی جی کی گھوڑی بے قابو ہو کر آپ ہی آپ بیلوں کی جوڑی سے ٹکرا گئی تھی

اور شاہ جی بابا بچوں کی طرح رونے لگے۔ انہوں نے اس بچے کو جسے ابھی ابھی وہ بری طرح مار رہے تھے، اپنی گود میں بھر لیا۔۔ اور بری طرح چیخنے لگے۔

" میرے بچے، مجھے غلط فہمی ہوئی۔ مجھے معاف کر دے "

مگر حضرت بچے یہاں تو ہوش میں نہ تھے۔ وہ تو اتنے پٹے تھے کہ ان کے جسم کی ساری قوتیں ان سے روٹھ گئی تھیں۔ شاہ جی بابا اپنے اس بے ہوش بچے کو گود میں اٹھا کر اندر لائے۔ اور سرفراز کی طرف دیکھا۔

سرفراز کی آنکھوں میں بھی کچھ ندامت جھلک رہی تھی۔ وہ منہ پھرا کر باپ کی نعش کے قریب جا پہنچا۔ اور بچوں کی طرح رونے لگا۔

اور جب دُوسری صبح ذیلدار کی نعش گھر کے صحن کے ایک کونہ ہی میں سپرد خاک کردی گئی، تو شاہ جی بابا اس کی قبر پر کھڑے اس بُری طرح رو رہے تھے جیسے ان کا بیٹا مرگیا ہو وہ بری طرح چیخ رہے تھے۔

" ضمیر! تو نے تو مجھ سے عہد کیا تھا اکٹھے مریں گے اور اب مجھ بدنصیب کو پیچھے چھوڑ کر خود آگے بڑھ گئے ہو" اور پاس کھڑے لوگوں کو ایسے محسوس ہو رہا تھا جیسے ان کے سینوں میں رکھے دِل ٹکڑے ٹکڑے ہو کر اُڑ جانا چاہتے ہیں۔

تھوڑی دیر بعد، شاہ جی بابا نے ،سرفراز کی پیشانی کو چُوم کر اسے گلے لگا لیا۔ اور اس قدر مری ہُوئی آواز میں جسے کوئی سُن نہ لے اس کے کان میں کہنے لگے۔

" سرفراز تو میرا بیٹا ہے اور منوّر تیرا بھائی ہے"

اور سرفراز کو جیسے یہ بات اچھی نہ معلوم ہوئی ہو اس نے اپنا سر جھٹک دیا۔ اور شاہ جی بابا اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے اندر لے گئے۔ اور زبیدہ کو دیکھا۔ زبیدہ ہوش میں تھی۔ مگر بُری طرح رو رہی تھی۔ بستی کی نائن نے جو زخموں کی مرہم پٹی کرنے میں کسی لیڈی ڈاکٹر سے کم نہ تھی۔ اس کے سارے جسم کے زخموں پر مرہم رکھ کر کوئی سینکڑوں پٹیاں باندھ دی تھیں۔ شاہ جی بابا نے روتی زبیدہ کی پیشانی چوم لی۔ اور اس کے کان میں بھی وہی بات کہی۔ جو سرفراز سے کی تھیں۔ اور نہ جانے کیسے زبیدہ کی آنکھوں سے بہنے والے آنسو اچانک بہنا بھُول گئے۔ اور اس کے دل میں ایک عجیب احساس جاگ اُٹھا۔ اس ہیرو منوّر کا احساس اور اس کے زخمی جسم میں دفعتاً ہزاروں لذتیں جاگ اُٹھیں۔ اور یہ لذتیں وہ تھیں جو رات اس نے عالم بے ہوشی میں اس منوّر کے سینہ سے کافی دیر لگے رہنے میں پائی تھیں۔

اور ادھر منوّر تھوڑے سے فاصلے پر بنے ہوئے مردانہ میں ایک بڑی سی چارپائی پر

اب تک بے ہوش پڑا تھا۔ اس کے بازو کی ایک ہڈی اپنی جگہ سے سرک گئی تھی۔ اور سارا جسم شاہ جی بابا کی خوفناک ٹھوکریں کھاکر سُوج گیا تھا۔ بستی کے جرّاح نے اس کا بازو چڑھادیا تھا اور جسم پر پٹیاں باندھ دی تھیں۔ مگر منوّر کے حواس کے ساتھ تو یاروں نے ہولی کھیلی تھی، اس لئے قائم ہونے میں نہیں آتے تھے۔ البتہ آنکھیں بُری طرح بہہ رہی تھیں۔ اور اس کے چاروں طرف پھیلی، سائرہ، زہرہ، رابعہ، صابرہ، اور مریم کو سسکیاں بھر بھر کر رو رہی تھیں صابرہ نے بہن سائرہ کے کندھے پر اپنا سر رکھ لیا تھا۔ وہ اندھی آج اپنی بدنصیبی کو اُس بُری طرح محسوس کر رہی تھی کہ اس کا دل بُری طرح کٹ گیا تھا۔ وہ غریب سوچ رہی تھی، یہ اندھی قدرت، یہ اندھی ان دیکھی قوت، کتنی جابر، کتنی ظالم اور کتنی غیر مآل اندیش ہے۔ وہ سوچ رہی تھی، وہ خود بھی اندھی ہے۔ مگر وہ تو ظالم ہیں۔ وہ تو جابر اور قاہر ہیں۔ پھر یہ اندھی قدرت کیوں ایسی ہے۔ جب انسانی دِل ایسی ہی بڑی چوٹ کھاتا ہے تو اس کے احساسات ایسے ہی ہوتے ہیں۔ اس میں بے چاری صابرہ کا کوئی قصور نہ تھا۔ اور اس صابرہ کے نصیب پر ادھر دوسرے کمرہ میں تو شاہ جی بابا رحمت بی بی کے ساتھ مِل کر آرے چلا رہے تھے۔

رحمت بی بی بہت دھیمی دھیمی آواز میں شاہ جی بابا سے کہہ رہی تھی " شاہ جی، تم شاید ان کی موت کے سبب کو سمجھ نہیں سکے "

اور شاہ جی بابا، اس انداز میں جواب دے رہے تھے:۔

" میں نہیں سمجھ سکا! جس نے اس ضمیر کے ساتھ ستّر برس کاٹے ہیں اور تو سمجھ گئی ہے۔ جو صرف چالیس سال سے اس کے ہاں آئی ہے۔"

رحمت نے کچھ نہیں کہا صرف شاہ جی بابا کی طرف دیکھا۔ وہ ان شاہ جی بابا سے ڈرتی بھی اور ان سے محبت بھی کرتی تھی، اسے علم تھا کہ اس کے مرحوم شوہر کو ان شاہ جی بابا سے

کتنی محبت تھی۔ اس لئے شاہ جی بابا کی اس طنز پر جواب دیئے بغیر ان کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا اور پہلے سے ذرا دھیمی آواز میں کہنے لگی

" مگر شاہ جی بابا تم تو بحث کرتے ہو۔ میں یہ کہہ رہی تھی ان کی حرکتِ قلب محض اس لئے بند ہوگئی ہے کہ وہ غیرت والے تھے۔ انہوں نے منوّر کی گود میں لیٹی زخمی اور ننگی زبیدہ کو دیکھا تو دل کو سنبھال نہ سکے۔"

شاہ جی بابا نے ایک ٹھنڈی آہ بھری اور اس انداز میں جواب دیا

"یہ میں اچھی طرح سمجھتا ہوں"

رحمت بی بی نے ان کی بات کاٹ لی

" اسی لئے میں کہتی ہوں کہ ان کی رُوح قبر میں بڑی پریشان ہوگی کچھ ایسا کرو کہ وہ اس رُوحانی عذاب سے بچ جائیں۔"

شاہ جی بابا نے بھولے پن سے پوچھا۔

" مگر میں کیا کروں۔ میرے بس میں کیا بات ہے۔"

رحمت بی بی کی آواز ذرا بلند ہوگئی " تمہارے بس میں کچھ ہے ہی نہیں۔ کیا تم منوّر کو زبیدہ سے بیاہ نہیں سکتے۔ کیا زبیدہ ایسی گئی گذری ہے"

اور یہ بات سُن کر شاہ جی بابا کا دماغ جیسے پھٹ چلا ہو۔ انہیں اپنے دل اور دماغ سے دھوئیں کے طوفان اُٹھتے محسوس ہوئے۔ ان کے چہرے کی رنگت بدل گئی اور وہ سہمے سہمے دل اور دماغ کے ساتھ سوچنے لگے۔

" اور فاطمہ کی رُوح کیا چیخ اور چلّا نہ اُٹھے گی، وہ تو فاطمہ کی اندھی بچّی صابرہ کے ہاتھ میں اپنے بیٹے کا ہاتھ پکڑا کر اسے کہنا چاہتا تھا، بیٹے! اس اندھی کا سہارا بن۔"

اور اس سے آگے وہ کچھ سوچ نہ سکے۔ رحمت بی بی نے ان کے کندھے پر اپنا دوسرا ہاتھ بھی رکھ دیا اور کسی قدر غصّے کے ساتھ کہنے لگی

اب تمہیں چُپ لگ گئی ہے۔ مرنے والوں کو یاد رکھنا تو آسان ہے۔ ان کی عزت بچانا کتنا مشکل ہوتا ہے۔

اور شاہ جی بابا کے دل اور دماغ سے جیسے ہر بات نکل گئی ہو وہ بُری طرح چیخے

رحمت بی بی تم یہ کیا کہتی ہو۔ تمہیں یہ کیا ہو گیا ہے۔ منوّر کیا چیز ہے اگر تم مجھے اپنے یار کی غیرت بچانے کے لئے ابھی ذبح کر دو تو میرے ہونٹوں پر آہ نہ پاؤ گی"

رحمت بی بی کے چہرہ پر پھیلی جھرّیاں شاید کچھ کم ہوگئیں اور اس نے شاہ جی بابا کے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے سرگوشی کی

" ساری لبتی نے، سارے لوگوں نے عورتوں اور مردوں نے بچّوں اور بوڑھوں نے زبیدہ کو منوّر کی گود میں بھرا دیکھا ہے۔ اب زبیدہ صرف اسی گود میں سر رکھ سکتی ہے۔ ورنہ میں اسے ذبح کردوں گی"

اور شاہ جی بابا پھر کانپ گئے اور رحمت بی بی کے ہاتھ کو اپنی آنکھوں پر رکھتے ہوئے جواب دیا " یہی ہو گا "

اور رحمت بی بی نے شاہ جی کے کندھے پر سر رکھ دیا اور بُری طرح رونے لگی۔ رُوح کی گہرائی تک پہنچنے والی نظر جنہیں ملی ہے۔ وہ اگر اس وقت شاہ جی بابا اور رحمت کے دلوں تک پہنچ سکتی تو اسے ایک عجیب منظر نظر آتا۔

ہر طرف آبشار گرتے، ندیاں بہتیں اور حوریں رقصاں اور لرزاں معلوم ہوتیں۔

دونوں نے بے خودی کے عالم میں یہ اتنی سی باتیں زبیدہ کی چارپائی سے چند گز پر

بچھی ہوئی مسند پر بیٹھ کر ی کردی تھیں۔ زبیدہ کی آنکھیں بند تھیں اور ان کا خیال تھا کہ وہ سو رہی ہے مگر وہ ظالم جاگ رہی تھی۔ اور اس کے زخمی جسم کی ایک ایک رگ اور ایک ایک نس ایک عجیب مسرت بھرا ناچ ناچ رہی تھی۔

دسواں باب

اور ادھر جب منور کے حواس اپنی جگہ پر آئے اور دل اور دماغ اس خوفناک چنگل سے آزاد ہوئے تو سائرہ نے سب سے پہلے اس کی پیشانی چوم لی۔ اور اس نے اس سائرہ کو اس طرح دیکھا جیسے موت کے چنگل سے دفعتاً آزاد ہو جانے والا بھائی اپنی، ماں جائی بہن کو دیکھتا ہے اور سائرہ کی آنکھوں سے دو موٹے موٹے آنسو بہہ کر منور کے چہرہ پر آن گرے۔ اور اسے ایسا محسوس ہوا جیسے اس کی ساری چھنی ہوئی نوتیں لے واپس مل گئی ہیں۔

صابرہ بھی پاس کھڑی تھی اسے ابھی تک یہ معلوم نہیں ہوا تھا کہ منور ہوش میں آچکا ہے اس کی آنکھوں میں ابھی تک آنسو تھے۔ منور نے یہ آنسو بہتے ہوئے دیکھ لئے تھے۔ اس لئے ایک عجیب مسرت سی پا رہا تھا۔ اچانک اس کے ہاتھ صابرہ کی طرف بڑھے اس نے صابرہ کا ایک ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور دھیمی سی آواز میں بولا

"صابرہ روؤ نہیں ہم اچھے ہوگئے ہیں۔"

اور صابرہ کا جی چاہا وہ منور پر گر پڑے مگر گر نہ سکی اور اپنی اس بے لبسی کے باوجود مسکرا دی۔ یہ بڑی خوشی تھی اس کے لئے کہ اس کا منور اچھا ہوگیا ہے اور بی زہرہ

کی خوشی کا تو کوئی ٹھکانا ہی نہیں تھا - وہ آپ ہی آپ اچھلنے کودنے اور خوشی کے کلمات الاپنے لگی تھی - اس کی آواز دوسرے کمرہ میں بھی جا پہنچی تھی جہاں بی زبیدہ آرام فرمارہی تھی - اور اس کا جی اچانک ایک عجیب بات کے لئے چاہنے لگا تھا - ان سنی، اور ان دیکھی بات کے لئے، وہ چاہ رہی تھی اپنی چارپائی سے اُٹھ کر نہیں اُڑ کر منور کے پلنگ پر جاگرے اور منور سے اس بری طرح لپٹ جائے کہ دونوں کی چلتی سانس رک جائے - وہ چاہنے کو تو یہ بات چاہ گئی، مگر اچانک یاد آیا مگر وہاں تو یہ بی سائرہ، یہ بی صابرہ بیٹھی ہیں اور یہ بی سائرہ وہی ہیں جن پر حضرت منور جان دیتے ہیں اور جن کی خاطر انہوں نے ہمارے بھیا کے کندھے کو مجروح کیا تھا - اور اس خیال کے آتے ہی، زبیدہ کے جسم، دل اور دماغ ہر چیز پر ایک مردنی سی مسلط ہوگئی - اور زخموں میں درد سا ہونے لگا - مگر اس درد نے، اور کتنا بے شرم تھا یہ درد، اسے گزری ہوئی رات یاد دلادی جب اس منور نے اسے اپنی گود میں بھر رکھا تھا - اس کا جسم کتنی جگہ سے چھل گیا تھا - اور سینہ میں تو کئی کانٹے چبھ گئے تھے - مگر یہ سارے زخم اس وقت نہ جانے کہاں غائب ہوگئے جب منور اسے اپنی گود میں ڈالے اس طوفانی اندھیری رات میں سڑک پر بیٹھا تھا - اور اس کے چہرہ صراحی دار گردن اور پیشانی پر ہاتھ پھیر رہا تھا - اور اس نے اچانک ایک عجیب لذت سی پاکر آنکھیں کھول دی تھیں - اور کچھ سمجھ میں نہیں آیا تھا اس لئے رونے لگی تھی اور اس رونے میں بھی کتنا مزہ تھا - زبیدہ نے سوچا کہ زخمی عورت اپنے محبوب مرد کی گود میں سر رکھ کر رونے میں بھی کتنی لذت پاتی ہے - اور یہ لذت ایک بار پھر اس کے سارے جسم اور دل پر چھاگئی اور اس لذت نے کس تیزی کے ساتھ اسے امی اور شاہ جی بابا کی وہ باتیں یاد دلادیں، جو تھوڑی دیر پہلے اس سے چند گز کے فاصلے پر کتنی دیر تک

ہوئی رہی تھیں، اور یہ باتیں یاد کیا آئیں، وہ ایک جھکولے کے ساتھ اُٹھ بیٹھی - اور آپ ہی آپ کھڑی ہوگئی۔ بی نائن تھوڑے فاصلہ پر بیٹھی اُونگھ رہی تھی - اس نے زبیدہ کو کھڑے دیکھا تو بجلی کی سی تیزی کے ساتھ اس کی طرف لپکی اور حیرت سے پوچھا

" بی بی تم اس طرح کیوں اُٹھ کھڑی ہوئیں - پٹیاں کھل جائیں گی اور زخم ہل جائیں گے"

زبیدہ کا جی چاہا اس گدھی کے سر پر اپنے سامنے رکھی میز اُٹھا کر دے مارے اُلو کہیں کی - زخموں کا رونا رو رہی ہے - اور اس خوشی کو تصور ہی میں نہیں لاتی جو ابھی ابھی اس نے محسوس کی ہے - مگر بے چاری نائن کیا جانتی تھی اس نے زبیدہ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں پکڑ کر اسے پلنگ پر بٹھا دیا اور درخواست کی

" بی بی لیٹ جاؤ، ابھی زخم تازہ تازہ ہیں "

اور زبیدہ لیٹ گئی - اس حرافہ نائن نے اس کے زخموں کو سچ مچ تازگی بخش دی تھی

اور ادھر شاہ جی بابا اور رحمت بی بی نہ جانے کیا کیا مشورے کرنے کے بعد منور کے کمرہ میں جا پہنچے تھے۔ لڑکیاں پرے ہٹ گئی تھیں اور شاہ جی بابا نے آگے کی طرف جھک کر منور کی پیشانی چوم لی تھی - اور اس کے کان میں روتی ہوئی آواز میں کہہ رہے تھے -

" رات مجھ کو بڑی غلط فہمی ہوئی اور میں نے تجھے اتنا مارا کہ تو ہوش و حواس کھو بیٹھا

اور بدمعاش سرفراز بھی اس سے یہی بات کہنے کے لئے اس کے سرہانے آن کھڑا ہوا تھا - اور جیسے ہی شاہ جی بابا منور کی پیشانی چوم کر پرے ہٹے سرفراز نے بھی ماں کے اشارہ سے نیچے جھک کر اس منور کی پیشانی چوم لی اور منور حیرت میں تھا یہ دفعتاً رقیب سے ممدوح کیسے بن گیا ہے پگلے کو اس سازش کا حال معلوم نہ تھا جو اس گھر میں ابھی تھوڑی دیر پہلے اس کے لئے کی گئی تھی - سرفراز کے بعد رحمت بی بی نے منور کی پیشانی چومی -

اور پاس کھڑی سائرہ اور رآلعیہ نے دانتوں میں انگلیاں داب لیں۔ ان کی سمجھ میں یہ انقلاب نہ آیا۔ اور یہ انقلاب ان کی سمجھ میں تو اس وقت آیا جب شام کو وہ چاروں اپنے صحن میں بیٹھی تھیں اور بی رحیمن کسی قدر حیرت اور خوشی کے ساتھ ان سے کہہ رہی تھی۔

" سائرہ بی تم نے کچھ اور بھی سُنا ہے؟ "

سائرہ بی کا مُنہ کھلے کا کھُلا رہ گیا۔ اور رحیمن نے آپ ہی آپ اپنی بات پُوری کر دی

" شاہ جی بابا اور رحمت بی بی نے منوّر اور زبیدہ کی سگائی کر دی ہے اور یہ ایک ایٹم بم تھا۔ نئی دریافت سے ہزاروں گنا زیادہ طاقت ور ایٹوم بم، یہ گرا اور ان چاروں لڑکیوں کے حواس چھین لے گیا اور رحیمن نے اس ساخت کا ایک اور بم لگے ہاتھوں پھینک دیا " اور بی سائرہ تم سرفراز سے بیاہی جاؤ گی ۔"

وہ تو حواس ہی میں نہ تھیں اس نئے بم نے مریم بی کے دل اور دماغ دونوں کے فانوس اُڑا دیئے۔ اور وہ ان تینوں پر اس طرح گر پڑی جیسے اس کی دنیا ویران ہو گئی ہو۔

اور رحیمن حیران رہ گئی۔ وہ نہیں جانتی تھی یہ دونوں خبریں ایسا طوفان کھڑا کریں گی اگر اسے معلوم ہوتا تو وہ یہ خبریں عام نہ کرتی۔ مگر اب تو وہ کہہ چکی تھی اور چاروں لڑکیاں ایک جیسی بے چارگی ایک جیسی بے بسی اور دُھندلے پن کے ساتھ رو رہی تھیں۔

اور صابرہ تو ایسے محسوس کر رہی تھی جیسے وہ کسی گہرے اور خوفناک کنوئیں میں گر پڑی ہو۔ زہرہ نے اس کے دونوں ہاتھ پکڑ لئے تھے اور ان ہاتھوں کو اپنی روتی آنکھوں پر رکھ لیا تھا اور اپنے چھوٹے سے دماغ سے جو اس دُنیا نے کسی قدر بڑا بنا دیا تھا سوچ رہی تھی ۔" کیا قدرت کے خزانے میں ہمارے لئے غم ہی غم ہیں کوئی خوشی نہیں۔

گیارھواں باب

اسی رات مریم اور سرفراز ایک دوسرے کی کمر میں بازو ڈالے باغ کے اس آخری کنج میں بیٹھے تھے جو حویلی سے کم سے کم دس فرلانگ کے فاصلے پر باہر کی دیوار کے بالکل ساتھ واقع تھا ۔ اور یہی وہ جگہ تھی جہاں سرفراز اکثر اپنی محبوب عورتوں کو لے کر بیٹھا کرتا اس کنج میں مریم اور وہ پہلے بھی کئی بار چھپے تھے ، مگر اس سے پہلے کبھی بھی مریم یہاں پہنچ کر روئی نہ تھی ۔ یہاں آتے ہی اس کا جسم تو مجسم راگ بن جاتا ۔ مگر آج تو وہ بُری طرح رو رہی تھی ۔ اس نے سرفراز کے دونوں ہاتھ پکڑ لئے تھے اور سسکیاں بھر بھر کر کہہ رہی تھی " اب مالک میرا کیا ہوگا ۔

اور سرفراز بہت حیران تھا آج سے پہلے اس کی کسی کھلونا لڑکی نے اپنی یہ حالت نہ کی تھی ۔ نہ اس طرح روئی تھی اور نہ اپنے بال ہی نوچے تھے ۔ وہ تو جن لڑکیوں کو یہاں لاتا وہ ہنستیں مسکراتیں ، وہ ان کے بال لہراتا ۔ ان کے مُنہ ، گال اور ہونٹ چومتا ۔ اور پھر ان کے جسموں کی رعنائیوں میں کھو جاتا ۔ اور آج بھی وہ اس مریم کو اس لئے یہاں لایا تھا ، اس کے جسم کی رعنائیاں سمیٹنے کی خاطر ۔ یہ کوئی ماتم کدہ نہ تھا ۔ یہ تو کنج راحت اور شادمانی تھا ۔ یہاں تو جوانی کی آرزوئیں مچلتیں ، دل دھڑکتے اور پھر یہ دھڑکتے اور لرزتے

دل اس کے مضبوط سینہ سے لگ جاتے۔

مگر اس سر بات کے باوجود سرفراز اس مریم کی اس حالت سے تھوڑا بہت متاثر ضرور تھا۔ یقیناً مریم اس کا کھلونا تھی۔ گاؤں کی دوسری جوان لڑکیوں کی طرح۔ مگر یہ کھلونا باقی تمام کھلونوں سے زیادہ دلچسپ اور زیادہ خوبصورت تھا۔

اس نے اس کھلونے کا کئی بار منہ چوما، اس کی آنکھوں سے بہنے والے آنسوؤں کو اپنی گرم گرم ہتھیلی سے پونچھا۔ اسے اپنے سینہ سے لگایا۔ اس کے بالوں کو الجھایا۔ مانگ بگاڑی مگر مریم کے آنسو بہنے سے نہ رُکے۔ آج وہ شاید جوان عورت نہیں رہی تھی۔ ایک ایسی بیوی بن گئی تھی جس کا محبوب شوہر اسے طلاق دے رہا ہو۔

اور یہ احساس بڑا تلخ تھا۔ سرفراز نے مریم کی جوانی سے کھیلنے کا کام شروع کرتے وقت اس غریب کو بڑے لالچ دیئے تھے اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کئی بار کہا تھا

" مریم میں تمہیں اپنی بیوی بناؤں گا "

اور یہ کتنی بڑی بات تھی اس مریم کے لئے، وہ ایسی بڑی بات کا خیال خواب میں بھی نہیں کر سکتی تھی۔ مگر یہ خواب تو نہ تھا آج سے کئی دن پہلے سرفراز نے اس کے خوبصورت منہ پر اپنا منہ رکھے اور اس کے ہونٹوں سے کھیلتے ہوئے یہ الفاظ کوئی سینکڑوں بار اس سے کہے تھے اور پگلی عورت انہیں صحیح سمجھ گئی تھی اور اپنا سب کچھ اس سرفراز کو دے ڈالا تھا۔ یہ کتنا جوان کتنا خوبصورت اور کیا تنومند تھا۔ اور اس تنومند جوان کے سینہ پر سر رکھے وقت مریم کو کتنا سکھ اور کتنا اطمینان میسر آتا۔ اور سکھ اور اطمینان تو بڑی کم یاب چیز ہے اور خاص طور پر اس مریم کے لئے تو یہ بہت بری طرح کم یاب تھی۔ اس کا باپ نہ جانے کب کا مر چکا تھا اور ماں بی رحیمن محض لستی کے بچوں اور عورتوں کے کپڑے سی سی کر گذر کرتی۔ اور اس بچی کو

سکھ کہاں سے ملتا۔ وہ حیران تھی۔ اور زیادہ سے زیادہ یہ ہوتا کہ کوئی جوان اور غریب کسان اس سے بیاہ کر لیتا۔ اور پھر وہ لڑکی سے عورت بن جاتی اور عورت سے ماں ، اور پھر یہ بچے بڑھتے ہی جاتے ۔ عام کسان عورتوں کی طرح اس کے ہاں بھی ایک ریوڑ کا ریوڑ بچے پیدا ہو جاتے اور وہ دن رات ان بچوں کو پالتی ۔شوہر کی خدمت کرتی اور کھیتوں اور جانوروں کی رکھوالی کرتی ایک بوڑھے بیل کی طرح مٹی میں مل جاتی ، یہ کیسی بے ہودہ اور کیسی دُکھ بھری زندگی ہوتی۔ مگر اب جب کہ وہ سرفراز سے متعلق ہو گئی تھی۔ اب جب کہ پورے کئی دن اور راتیں اس سرفراز نے اپنے جوان سینہ کے ساتھ لگا لگا کر اسے اپنی بیوی بنانے کا عہد کیا تھا۔ وہ سب کچھ بھول گئی تھی اور آج سے پہلے تک سمجھ رہی تھی کہ وہ مستقبل قریب میں ایک بڑی عورت بننے والی ہے مگر آج کی اس خبر نے جو اس کی ماں ہی نے نشر کی تھی ، اس کے تمام سنہری قلعوں کو ریت کے ذرّوں میں تبدیل کر دیا تھا۔ وہ روتی ، بلکتی اور سسکیاں نہ بھرتی تو اور کیا کرتی ۔ یہ تو ایک اچانک طوفان اُٹھ آیا تھا۔ یہ تو ایک سیلاب تھا۔ خوفناک اور لرزا دینے والا سیلاب ، اور اس کی امیدوں اور آرزوؤں کی ساری کھیتی اور کھیتی کا ایک ایک پتہ بہہ گیا تھا ۔ اور وہ یہ تباہی دیکھنے کے لئے زندہ تھی ۔ اور اس مرد کے آغوش میں تھی جو اس طوفان اور سیلاب کا اوّلین و آخرین سبب تھا۔ اور یہ مرد محض اس کے آنسو پونچھ رہا تھا۔ اس کی خوبصورت لانبی لانبی آنکھیں ہی چوم رہا تھا۔

مریم کا جی چاہا ، وہ بُری طرح چیخ اُٹھے ۔ اس شخص کے جوان چہرے پر اپنے دونوں ہاتھوں کے ناخن چبھو دے۔ مگر یہ دھوکے باز مرد تو اس کی زندگی کے دروازہ پر دستک دینے والا پہلا مرد تھا۔ یہ وہ پہلا گبرو تھا جس کے حضور اس نے اپنی نسائیت کی ہر متاع پیش کر دی تھی اور جیسے ہی اس کے باغی دل میں اس مرد کے خلاف یہ خیال آیا اس نے اپنی

زلفیں نوچ لیں اور ایک زور کا گھونسا اپنی پیشانی پر کھینچ مارا - اور سرفراز بُری طرح گھبرا گیا اور مریم کو اپنے دونوں بازوؤں میں اس طرح بھینچ لیا جیسے وہ ایک ننھی سی جان ہے۔ اور یہ مریم خیالوں کے سارے دائروں سے نکل کر، اس جوان مرد کے بازوؤں میں سمٹ گئی ۔ اس کا دل ، دماغ اور سینہ حتیٰ کہ جسم اور جسم کی ایک ایک رگ ، ایک نئے جوش اور ایک نئی گرمی سے بھر گئی۔

اور اب وہ پھر مرد اور عورت تھے ۔

سرفراز اس کے جسم سے کھیل رہا تھا اور وہ ٹوٹی ہوئی بیل کی طرح اس کے سامنے پڑی تھی ۔ اس کی زبان پر نہ کوئی شکوہ تھا اور نہ شکایت تھی۔ اور شاید دل میں مستقبل کے متعلق کوئی آرزو بھی باقی نہ رہی تھی ۔

اور رات چیختی چلاتی بھاگتی گئی ۔

بارھواں باب

اور اس زبیدہ نے اپنے انوکھے پن کا مظاہرہ شروع کر دیا تھا۔ ابھی اس کے جسم کے زخم اچھی طرح بھرنے نہ پائے تھے کہ اس نے اپنے اس انوکھے پن کے باعث اپنے سینہ کے اندر رکھے اس گوشت کے لوتھڑے میں جسے لوگ دل کہتے ہیں اپنی جوان آرزؤوں اور اُمنگوں کے نشتر آپ ہی آپ چبھو دیئے تھے، اور یہ دل آدمی کے جسم میں سب سے بیہودہ بے پروا بے ڈھنگی اور بے تکی چیز ہے۔ اور لنگی زبیدہ یُوں ہی بستر پر لیٹے لیٹے اس بے ڈھنگی چیز سے کھیلنے لگی تھی۔ عقلمند اور دانا قسم کے لوگ دوسروں کے دلوں سے کھیلتے اور انہیں نشانہ بناتے ہیں اور یہ زبیدہ اپنے دل سے کھیل اور اسے اپنی ستم رانیوں کا نشانہ بنا رہی تھی۔ اور کتنی انوکھی تھی یہ زبیدہ۔ وہ ماں اور شاہ جی بابا کے باہمی مشوروں کو سُن سُن کر اپنے جسم کا ہر زخم بُھول گئی تھی اور جب بی نائن مرہم کی پلیٹ اس کے سرہانے رکھ کر اس کے زخموں پر مرہم کے پھائے رکھتی تو زبیدہ آپ ہی آپ ہنس پڑتی اور سوچتی کتنی احمق ہے یہ بی نائن کہ اتنی ساری مرہم اور ایسے اچھے پھائے یُوں ہی ضائع کر رہی ہے۔ مگر جب یہ نائن اس کے زخموں کو دھوتی تو زبیدہ کو ایسا معلوم ہوتا جیسے یہ بے ہُودہ نائن اس کے جسم میں سوئیاں چبھو رہی ہے۔ اس کے ہونٹوں سے مسکراہٹ غائب ہو جاتی اور وہ آنکھوں میں غصہ بھر کر چیختی!

"نائن تم بڈھی ہوگئی ہو، تمہارے بال کتنے سفید ہوگئے ہیں۔ مگر تم ابھی تک اتنا نہیں جان سکیں کہ جسم پر مالش کس طرح کرتے ہیں۔"

اور نائن سوچنے لگتی، یہ بی بی زخمی ہونے کے بعد کیسی عجیب وضع کی بن گئی ہیں۔

اور سچ مچ زبیدہ ایک عجیب وضع کی بی بی بن گئی تھی۔ ایسی بی بی اس بستی میں کیا اس پورے ضلع اور شاید ملک بھر میں کوئی اور نہ تھی۔ اور یہ عجیب بی بی اپنے بستر پر لیٹے لیٹے ہر لمحہ اور ہر آن سوچتی رہتی۔ اے کاش مجھ میں اتنا حوصلہ ہو جائے کہ میں حادثہ والی رات کی طرح پھر اپنی سیاہ کوتل گھوڑی پر دیوانہ وار سوار ہو جاؤں اور یہ گھوڑی احاطہ کے اندر بنے ہوئے گول اور کبھی نہ ختم ہونے والے دائرہ پر بھاگتی بھاگتی اچانک احاطہ کی دیوار پھاند جائے۔ پھر پہاڑی پر چڑھتے چڑھتے یہ گھوڑی بیلوں سے ٹکرا جائے اور وہ خود گھوڑی کی پشت پر سے اُڑ کر جھاڑیوں پر جا گرے اور جھاڑیوں کے سارے کانٹے اس کے ریشمیں جسم میں چبھ جائیں اور پھر منور کے عجیب و غریب بازو اس کی طرف پھیل کر اسے جھاڑیوں سے باہر نکال لیں اور پھر وہ بیچ سڑک سارے جہاں، سارے عالم اور ساری خدائی کی روشن آنکھوں کے سامنے منور کی گود میں پڑی ہو اور اس کی پیشانی، گردن اور سینہ کی خراشوں سے خون کے قطرے ٹپک رہے ہوں —— اور یہ اتنی بار ہو جتنی ساعتیں اس دن و رات میں ہیں۔ اور یہ دن اور رات بھی قیامت تک ختم نہ ہونے پائیں۔

اور یہ عجیب آرزو دل کے سمندر میں پھیلتی اس کے جسم سے پھوٹنے لگی تھی اور زبیدہ نائن کی ہدایات کے باوجود جب وہ اس کے کمرہ سے باہر نکل جاتی اپنی چارپائی پر سے اُٹھ کھڑی ہوتی۔ بھاری چادر جسم سے اتار پھینکتی۔ قمیص کے بٹن کھول دیتی۔ پٹیاں نوچ لیتی اور آئینہ کے سامنے کھڑے ہو کر، اس آرزو میں آنکھیں بند کر لیتی کہ ابھی منور، بجلی کے پروں پر اُڑتا

ں شیشہ میں آن کھڑا ہوگا اور اسے اپنے سینہ سے لگائے گا۔

اور جب اسے آئینہ کے پاس کھڑے کھڑے کافی دیر ہو جاتی اور منوّر نہ آتا تو وہ جھنجھلا کر
پی قمیص کے بٹن پھر بند کر لیتی اور وزنی چادر اپنے سارے جسم کے ارد گرد لپیٹ کر پھر چارپائی پر
بیٹھ جاتی اور آپ ہی آپ رونے لگتی اور ایسے میں اگر کبھی نائن، سرفراز یا امّی آجاتیں تو
اسے روتا دیکھ کر سمجھتیں اس کے زخموں میں درد ہو رہا ہے۔ اور اس کے جسم پر جھک کر اس کے
زخم دیکھنے لگتیں اور زبیدہ انہیں پرے ہٹا دیتی۔

سرفراز، امّی اور نائن تینوں حیران رہ جاتے۔ امّی کہتیں

"کیوں میری بٹیا یہ تمہیں کیا ہو گیا ہے؟"

اور بٹیا امّی کو کیا بتاتی کہ اسے کیسی عجیب بیماری لگ گئی تھی۔ اس کے ذہن کے اندر
کتنا بڑا ناسور ہو گیا تھا۔ اور یہ ناسور دن بدن بڑھتا جا رہا تھا۔

یوں اس کے زخم اچھے ہو رہے تھے۔ اور ہوتے ہوتے یہ زخم بالکل مندمل ہو گئے۔
اور اس نے غسل صحت بھی کر لیا۔ مگر اس کے ذہن کے ناسور کی گہرائی پہلے سے زیادہ بڑھ گئی تھی
اور اس رات جب شام کے قریب اس کی امّی اسے اس کا جہیز دکھا رہی تھیں اس پر عجیب قسم کی دیوانگی
طاری ہو گئی۔ اور اس نے ایک بڑا سا جوڑا ماں کے ہاتھ سے چھین کر اپنے جسم پر لپیٹ لیا اور اس
کمرہ کی طرف بھاگی جہاں منوّر ابھی تک صاحب فراش تھا۔ مگر ابھی وہ دروازہ پر سے چند قدموں
کے فاصلے پر ہی تھی کہ سرفراز اندر سے باہر آیا اور اسے اس طرح کھڑے دیکھ کر پوری حیرت کے
ساتھ آگے بڑھا اور وہ بھائی کو دیکھ کر شرما گئی اور پیچھے کی طرف بھاگی اور وہ جوڑا وہیں پھینک کر
اپنے کمرے میں پہنچ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی اور جب امّی اور سرفراز دونوں اس کے پیچھے
پیچھے آئے اور اس سے اس بے ہودگی کا سبب پوچھا تو وہ کچھ کہہ نہ سکی اور امّی کو شبہ ہونے لگا

کہ اس کی بچی کو کسی آسیب نے آن دبوچا ہے۔ یہ کتنی دانا اور کتنی زیرک لڑکی تھی۔ اس نے تو اس حادثہ سے پہلے کبھی ایسی حرکت نہ کی تھی۔

اس رات مولوی صاحب اور شاہ جی بابا اس کے سرہانے بیٹھے کچھ پڑھ پڑھ کر اس پر پھونک رہے تھے اور زبیدہ دل ہی دل میں کہہ رہی تھی

"کتنے احمق ہیں یہ لوگ"

سچ مچ کتنے احمق تھے یہ لوگ جو حقیقت نہیں جانتے تھے اور اسے پانے کی کوشش نہیں کرتے تھے ــــ اور جب تھوڑی دیر بعد یہ احمق لوگ وہاں سے اٹھ کر چلے گئے اور فضا ساکت و صامت ہو گئی۔ نیند نے گھر کی ہر آنکھ کو بند کر دیا تو زبیدہ ابھی تک جاگ رہی تھی وہ اپنے پلنگ پر سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی اور ہزار شرم اور ہزار اضطراب کے ساتھ اس کمرہ کی طرف بڑھنے لگی تھی جس میں منور میاں سو رہے تھے۔ دروازہ بھڑا تھا۔ اس نے دروازہ کھول لیا۔ دبے پاؤں آگے بڑھی منور کے پلنگ کے قریب آئی اور منور کو دیکھنے لگی۔ منور کا چہرہ اور سینہ دونوں ڈھکے نہ تھے جو چادر اس کے باقی جسم کو ڈھانکے تھی وہ یہاں پہنچ کر تر بہ تر ہو گئی تھی۔ اور یہ سوتا منور، کتنا حسین اور کتنا رعنا معلوم ہوا، اس زبیدہ کو کہ اس کا جی چاہا، اس سارے منور کو اپنی آنکھوں کے رستے اپنے دل میں اتار لے۔

یہی تو اس کا ذہنی محبوب تھا، یہی تو وہ تھا جس کے تخیل کو وہ اپنے دل میں پالتی رہی تھی اور پھر یہی تو وہ تھا جس کے بازو اسے اپنے اندر بھر کر جھاڑیوں سے نکالنے کے بعد بستی میں لائے تھے۔ اور یہ بازو ــــ اور یہ سینہ کتنا عجیب تھا۔ کھڑی کھڑی زبیدہ کا جی چاہا وہ اس سینہ میں بھر سمٹ جائے۔

طاق میں رکھا لمپ بہت دھیمے دھیمے جل رہا تھا اور اس دھیمی روشنی میں،

زبیدہ کو اپنا سارا وجود دھواں بن کر اڑتا اور دور اوپر فضا میں پہنچ کر کسی غیر معلوم وسعت میں گم ہوتا محسوس ہوا، مگر یہ دھواں بن کر اڑتا وجود چند لمحے بعد پھر ایک عورت کا جسم بن گیا۔ ایسی جوان عورت کا جسم جو اپنے محبوب کو اپنے سامنے سوتا پاکر مچل اور تڑپ رہی ہو۔ اور اس مچلتی اور تڑپتی عورت کو ہمت نہ ہوئی کہ وہ اس محبوب مرد کو جگا سکے۔ اور اگر وہ اس محبوب مرد کو جگا دیتی تو اسے اس رات معلوم ہو جاتا کہ جسے وہ کوئی بڑا گبرو اور بیس بائیس سال کا جوان سمجھ رہی تھی۔ وہ محض ساڑھے پندرہ سال کا تھا۔ اس کی اپنی عمر سے دو تین سال چھوٹا۔

اور اس کے چہرہ پر تو اتنی معصومیت تھی، اتنی نزاکت اور بھولا پن تھا کہ وہ ایک جوان لڑکی کا چہرہ معلوم ہوتا تھا۔ بالکل مریم جیسا چہرہ اور اگر زبیدہ جہاندیدہ ہوتی تو اس معصوم اور بھولے چہرہ کو دیکھ کر ہی اس کی عمر کا اندازہ کر لیتی۔ مگر وہ وقت عمروں کے اندازے کا نہ تھا، وہ تو محض عبودیت اور ریاضت کے لمحات تھے۔ اور زبیدہ اسی عبادت میں مصروف تھی۔ وہ کتنی دیر تک وہیں کھڑی رہی۔ وہ بڑے حوصلوں کے ساتھ آئی تھی۔ وہ اس منور کے بارہ میں کیسی کیسی ذہنی عیاشی کرتی رہی تھی۔ مگر اب اس وقت اس میں اتنی بھی ہمت نہ تھی کہ وہ ذرا جھک کر اس منور کی پیشانی ہی چوم لے۔

نہ جانے یہ عورت بھی کیا مخلوق ہے۔ ابھی وہ منور کے چہرہ کی رعنائیوں میں کھوئی تھی ابھی اس کے تصور کے پردہ پر ایک عجیب صورت ابھری اور یہ صورت سائرہ کی تھی۔ زبیدہ کا دل اس صورت کو دیکھ کر کانپ اٹھا۔ اور سائرہ کی یہ ذہنی صورت ہنسنے اور قہقہے لگانے لگی۔ اور زبیدہ کو ایسا محسوس ہوا جیسے یہ سائرہ اس سے کہہ رہی ہے:۔

مجھ سے تم نے میرا محبوب تو چھین لیا ہے مگر کتنی بزدل ہو اس کے چہرہ کو چھو تک نہیں سکتیں۔ اور میں اس کے سارے جسم کو ہزاروں بار چھو بھی چکی ہوں اور چوم بھی۔

اور زبیدہ کی آنکھوں میں ایک عجیب سی آگ بھر گئی ۔ اور سائرہ کی تصویر اس کی آنکھوں میں یہ عجیب آگ بھر کر دفعتاً غائب ہو گئی ۔ اور زبیدہ نے بجلی کے ایک جھٹکے کے ساتھ آگے جھک کر منور کی پیشانی چوم لی اور شاید زبیدہ کے بازوؤں کے دباؤ سے منور کا زخمی بازو ہل گیا تھا یا زبیدہ کے ہونٹوں نے اس کی پیشانی کی رگوں میں کوئی برقی رو دوڑا دی تھی کہ اس کی آنکھیں بوجھل اور لمبی لمبی موٹی موٹی آنکھیں کھل گئیں ۔ ابھی زبیدہ اس کے سینہ پر جھکی اس کی پیشانی پر اپنے جلتے اور کانپتے ہوئے ہونٹ رکھے تھی کہ منور کی آنکھیں اسے اپنی طرف گھورتی محسوس ہوئیں ۔ وہ سر سے لے کر پاؤں تک کانپ گئی ۔ اور ایک لحظہ کے لئے اس کا کانپتا جسم منور کے سینہ پر گر پڑا ۔ اور پھر جیسے اس کے اندر بیٹھی عورت جاگ گئی ہو وہ یہاں سے بھاگ نکلی ۔ منور کی نگاہوں نے اس کا تعاقب کیا ۔ حیرت اور استعجاب کے ساتھ مگر زبیدہ کے اندر بیٹھی عورت نے اس کے سارے جسم کو ہمہ تن بجلی بنا دیا تھا ۔ وہ سرپٹ بھاگی جا رہی تھی اسے تن بدن کا ہوش نہ تھا اور وہ یہ بھول سی گئی تھی کہ اس کا کمرہ دائیں طرف ہے یا بائیں طرف ، اور جب وہ بھاگتی بھاگتی کمرہ کے دروازہ پر پہنچی تو دروازہ بھڑا تھا مگر اس کا سارا جسم اس بھڑے ہوئے دروازہ کے ساتھ کچھ اس زور سے ٹکرایا کہ دروازہ کھل گیا اور وہ دھم سے اندر آن گری ۔ یہ اس کا نہیں سرفراز کا کمرہ تھا ۔ اور سرفراز اس وقت مریم سے لپٹا سو رہا تھا ۔ اس دھماکے نے اس کی آنکھ کھول دی اور وہ ہڑبڑا کر اٹھا ۔

اور کمرہ کے مدھم لیمپ کی لال لال دھیمی دھیمی روشنی میں زبیدہ کو دروازہ کے قریب گرا پڑا پا کر مبہوت رہ گیا ۔

مریم بھی جاگ گئی اور اپنے کپڑے سمیٹتی ہوئی غسل خانہ کی طرف اس طرح بھاگی جیسے زلزلہ آیا ہو ۔ اور کمرہ کی چھت اس کے سر پر گر پڑنے والی ہو ۔ اور جب اس نے غسل خانہ کا

دروازہ بند کر لیا، تو سرفراز کی جان میں جان آئی۔ اور وہ تہہ بند سنبھالتا ہوا چارپائی سے اُٹھ کر گری پڑی زبیدہ کے سرہانے آن بیٹھا۔ اسے خیال آیا زبیدہ سوتے سوتے ڈر گئی ہے۔ اور ڈر کر یہاں آ گری ہے۔ اس نے زبیدہ کو اُٹھایا تو اس نے بہت بُری طرح سہمے سہمے اسے دیکھا اور بھائی کو پہچان کر بہت بری طرح شرما گئی۔ اور پھر نہ جانے کیوں آپ ہی آپ رونے لگی اور بھائی نے اسے اپنے کندھوں کا سہارا دے کر اوپر اٹھایا اور ہولے ہولے اسے اس کے کمرہ کی طرف لے چلا۔

اور جب زبیدہ اپنے پلنگ پر پھر لیٹ گئی تو اسے ایسا محسوس ہوا جیسے ایک بڑا طوفان اس کے سر سے گزر گیا ہو۔

سرفراز بھاگتا بھاگتا ماں کو بلا لایا۔ اور بڑھیا آتے ہی زبیدہ سے لپٹ گئی۔ اس کی پیشانی چومتے ہوئے سرگوشی کی

کیوں میری بچی؟

اور زبیدہ بہت زور سے سسکیاں بھرنے لگی۔ اور ماں نے سرفراز کو حکم دیا شاہ جی کو بلا لائے۔ مگر شاہ جی وہاں کہاں تھے وہ تو سائرہ، صابرہ اور زہرہ کے ہاں تھے۔ یہ بچیاں اکیلی تھیں اور شاہ جی ہر رات وہیں جا کر سویا کرتے۔

سرفراز نے ماں کی اس عجیب خواہش کو سُنا، تو کہنے لگا

ماں شاہ جی بابا تو اپنے گھر ہیں۔ اور اس اندھیری رات میں اور ایسے وقت میں میں ان کو کیسے بلا لاؤں گا۔

اور پھر زبیدہ سوتے سوتے میں ڈر گئی ہے۔ ایسی پریشانی کی کیا بات ہے۔

اور زبیدہ سنبھل گئی، اور ہولے ہولے آپ ہی آپ رکتی رکتی زبان میں ماں سے

کہنے لگی :-

" ہاں ماں! میں ڈر گئی تھی ۔ شاہ جی بابا کو نہ بلائیے "

اور ماں نے اسے اپنے سینہ سے ایک بار پھر لپٹا لیا ۔ اور سرفراز کو چھٹی مل گئی ۔ اور وہ اپنے کمرہ کی طرف بھاگا ۔ اور اندر جاتے ہی غسل خانہ کا دروازہ کھول کر ڈری ڈری سہمی سہمی مریم کو باہر نکالا اور اس کی پیشانی چومتے ہوئے ، اس کے کان میں سرگوشی کی ۔

سرکار بھاگ جاؤ یہاں سے ۔

اور مریم نے کانپتے کانپتے جواب دیا ، مگر باہر بڑا اندھیرا ہے اور مجھے ڈر لگتے ہے ۔

سرفراز نے ، اسے اپنے سینہ سے لپٹا لیا اور ہولے ہولے اس کے ساتھ باہر کی طرف بڑھنے لگا ۔

اور ادھر زبیدہ ماں کے سینہ سے لگی ایک عجیب سکون پا رہی تھی اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے ماں نے اس کے سارے اضطراب ، اس کی ساری بے چینیاں اور گھبراہٹیں کہیں دُور اُٹھا کر پھینک دی ہیں ۔ اور آپ ہی آپ نیند اس کی بوجھل آنکھوں میں بھر گئی ۔ اور وہ ماں کے سینہ پر ہی سر رکھ کر سو گئی ۔

مگر وہ بدنصیب ابھی تک جاگ رہا تھا ، جس کے اوپر جھک کر اس انوکھی زبیدہ نے اس کی پیشانی پر ایک عجیب و غریب بوسہ دیا تھا ۔ اور اس کے حواس پر چھایا ہوا نیند کا پردہ سرک نہیں ہٹ گیا تھا ۔ اور ابھی تھوڑی دیر پہلے جب یہ زبیدہ اس کے پلنگ کے قریب کھڑی اس کے چہرہ کی رعنائیوں میں کھوئی تھی وہ پگلا عالم خواب میں ایک عجیب خواب دیکھ رہا تھا ۔ دھندلا دھندلا اور غیر واضح خواب — غالباً یہ اس کا اپنا مکان تھا جہاں اس کی صابرہ اندھی اور بھولی صابرہ اس کے دائیں ہاتھ کو اپنے موہنے موہنے نازک نازک سے ہاتھ میں لئے اس کے

ساتھ لگی کھڑی تھی۔ اس کی آنکھیں بہہ رہی تھیں اور آنسو ٹپ ٹپ کرکے منور کے ہاتھ پر گر رہے تھے۔ منور نے اپنی اس صابرہ کو جو اسے ساری دُنیا کی نعمتوں سے زیادہ عزیز تھی۔ اس طرح روتے دیکھ کر اپنے سینہ سے لگا لیا اور بہت دھیمے دھیمے انداز میں سرگوشی کی

"اے صابرہ تو میری ہے، اور میں تیرا ہوں۔

مگر نہ جانے اس کی یہ سرگوشی ایک طوفان خیز شور میں کیسے تبدیل ہو گئی۔ اور ان دونوں کو ایسا محسوس ہوا جیسے ساری فضا شور کے ان الفاظ کو دہرا رہی ہے۔ اور ابھی یہ شور برپا تھا کہ ہوا کے دوش پر اُڑتی ایک جوان و رعنا عورت، عین ان دونوں کے سر دل پر آن بیٹھی اور اس کے جوان جسم کا بوجھ اس قدر زیادہ تھا کہ بی صابرہ اس بوجھ کو برداشت نہ کر سکی۔ اس کی گرفت چھوٹ گئی اور وہ دھم سے زمین پر آن گری۔ اور وہ خود بھی حیران و ساکت ایک عجیب جھٹکے کے ساتھ اپنی جگہ سے کافی پیچھے کو سرک گیا۔ اور وہ جوان عورت عین اس جگہ کھڑی ہو گئی جہاں وہ دونوں ابھی ابھی ایک دوسرے سے لپٹے تھے اور اس جوان عورت کی آنکھوں میں کتنی مستی کتنی رعنائی اور کتنا وقار تھا۔ منور ان کو دیکھ نہ سکا۔ اور مُنہ پھیر لیا۔ مگر یہ عورت ہنستی اور مُسکراتی اس کی طرف آئی اور اس کے دونوں کندھوں پر ہاتھ رکھ کر کہنے لگی

"منور میاں میں زبیدہ ہوں"

اور منور میاں کانپنے لگے۔ آنکھ کھل گئی اور اس زبیدہ کو اپنے اوپر جُھکے اپنی پیشانی چومتے پایا۔ اور یہ وہی عورت تھی، حسین اور جوان عورت جسے اس نے جھاڑیوں میں پھنسے ہوئے پا کر اپنے بازوؤں میں سمیٹا تھا اور بھری بستی کے سامنے اسے اس طرح اُٹھائے اُٹھائے، کئی جریب کا فاصلہ طے کرکے اس کے گھر لایا تھا۔ اس نے اپنے اُوپر

کئی روشن، مشتبہ، غم ناک، قہرآلود، خشمگین اور شوخ و حریص نگاہیں اُٹھتی دیکھی تھیں مگر وہ اپنے اس فعل پر ذرا نہیں شرمایا تھا۔ اور اسے اپنا دل مضبوط سے مضبوط تر ہوتا محسوس ہوا تھا۔ اور جب ایسی عورت رات کے دھندلکے میں، جب کہ سارا عالم سو رہا ہو، اس کی خواب گاہ میں آن کر اس کی پیشانی چوم رہی ہو۔ تو وہ اس پر خفا نہ ہو سکتا تھا وہ اس سے یہ تک نہ سہہ سکتا تھا۔ تو نے یہ حرکت کیا کی ہے اور پھر یہ عورت ہزار خوبیوں ہزار رعنائیوں اور ہزار جوانیوں کی مالک تھی، اس کے جسم میں راگ اور نغمے کی گھنٹیاں بندھی تھیں، اور یہ گھنٹیاں ابھی ابھی جب کہ وہ کانپ کر اس کے اُوپر گر گئی تھی کس تیزی کے ساتھ بجنے لگی تھیں۔ اور ان کی سُریلی اور چھنچھناتی آواز اس کے ظاہری کانوں سے نہیں دل کی سماعت سے ٹکرا کر کس سُرعت کے ساتھ اس کے جسم کی رگ رگ اور نس نس میں سما گئی تھی۔ اور جب وہ اچانک بھاگ اُٹھی اور ٹھنڈی ہوا کے ایک عجیب و غریب جھونکے کی صورت اس کے کمرہ سے نکل گئی تو اسے ایسا محسوس ہونے لگا جیسے وہ کسی عجیب کیفیت سے محروم کر دیا گیا ہو۔ مگر لمحہ بہ لمحہ، لحظہ بہ لحظہ... اس کا دماغ، اس کا دل اور جسم اپنی اصلی حالت پر آتا گیا۔ اور اسے اپنے خواب کی ایک ایک بات یاد آنے لگی۔ اور اس کا دل اچانک چیخ چیخ کر اس کے دماغ میں کہنے لگا:۔

ارے پگلے یہ عورت تو غاصب ہے۔ اس نے تو اچانک ایک حادثہ کی صورت میں اس کی زندگی کی تختی پر نمودار ہو کر، اس سے ایک اس لڑکی کو چھین لیا ہے۔ جو متواتر پندرہ سال سے اس کے ساتھ ساتھ رینگ چل پھر اور ناچ اور کود رہی تھی۔ اور یہ لڑکی تو وہ تھی جس کے ہاتھ میں ہاتھ دے کر اس نے کہا تھا۔

"اری صابرہ میں تیرا سہارا ہوں"

اور یہ لڑکی تو اندھی تھی، احتیاج اندر احتیاج تھی۔ وہ لڑکی نہ تھی، بے بسیوں بے چارگیوں اور مظلومیتوں کا مجسمہ تھی۔ اور ایسے مجسموں کو اس رنگ و بو کی دُنیا، اس تصنع پسند اور تند مزاج عالم میں کوئی دُوسرا قبول نہ کر سکتا تھا۔ اس نے سوچا۔ اس کے آس پاس رہنے والے مرد تو عورتوں کو بیاہ کر اپنے گھر اس لئے لاتے ہیں کہ یہ عورتیں ان کے گھروں کی رکھوالی کریں۔ ان کے لئے کھانا پکائیں۔ ان کے کپڑے سئیں۔ ان کے پاؤں داہیں ان کے احکام پر ایک لونڈی کی طرح رقص کریں۔ اور یہ رقص اتنا لمبا اور اتنا طویل ہو، کہ وہ عمر کی زنجیر میں بندھی بوڑھی ہو جائیں۔ اور اس دوران میں درجنوں بیٹوں اور بیٹیوں کی مائیں بن چکی ہوں۔

اس نقطہ پر پہنچ کر منور کا دماغ کانپ اُٹھا اور اس نے سوچا

اور اس کی یہ صابرہ تو کسی قابل نہ تھی۔ وہ تو آپ اپنی جگہ سے سرک کر ادھر اُدھر نہ ہو سکتی تھی، وہ تو خود دُوسروں کی محتاج تھی، کہ وہ اس کی خدمت کریں۔

رات اپنا دامن سکیڑنی ختم ہو رہی تھی اور دُور اُفق پر سحر کی علامتیں ظاہر ہونے لگی تھیں۔ مگر اس غریب منور کا دماغ تو سوچتے سوچتے بھٹی کی طرح جلنے لگا تھا۔ اور جسم تو جلتی ہُوئی لکڑی کی صُورت اختیار کر گیا تھا۔ وہ ایکا ایکی پلنگ سے اُٹھ بیٹھا اور بُری طرح چیخا۔

"میں یہ کبھی ہونے نہیں دُوں گا۔ میں صابرہ کا سہارا بنوں گا۔ اور اس کی ساری بے بسیوں اور بے چارگیوں کے باوجود اسے اپنی دُلہن بناؤں گا۔"

اور ابھی اس کے یہ الفاظ اس کی زبان سے ادا ہو رہے تھے کہ شاہ جی بابا نے اندر قدم رکھا۔ وہ تہجد کی نماز پڑھنے کے بعد، اپنے اس بچّے کی پیشانی چُومنے آئے تھے۔ اور اس کے یہ الفاظ سُن کر بُری طرح کانپ اُٹھے تھے اور ہولے ہولے سہمے سہمے اس کی طرف

بڑھ رہے تھے ـــــ انہوں نے اسے اپنے سینہ سے لگا لیا ۔ اور کسی قدر روتی روتی آواز میں کہنے لگے

میرے بچے ، مجھے تیری خواہش معلوم ہے ۔ اور میں خوش ہوں کہ تو بے لبی اور بے چارگی سے محبت کرتا ہے ۔

مگر میرے بچے یہاں صورتِ حال کچھ عجیب بن گئی ہے ۔ یہاں تیری نہیں ، تیرے باپ ، بڈھے اور موت کے دروازہ پر دستک دینے والے باپ کی عزت کا سوال ہے ۔

ذیلدار میرا دوست اور میرا ہم جولی تھا ۔ تو جان بوجھ کر نہیں ان جانے بوجھے، اس کی موت کا سبب بنا ، لبتی کا کوئی آدمی ، سوائے چند کے جن کی زبانوں پر مصلحت کے تالے لگ گئے ہیں ۔ حقیقت سے باخبر نہیں ہے ۔ سب یہ سمجھتے ہیں کہ زبیدہ اس خوفناک اندھیری رات میں تیرے پاس گئی تھی ۔

منوّر نے بات کاٹ لی ، مگر بابا یہ بالکل جھوٹ ہے ۔ میں نے اس رات سے پہلے اسے دیکھا تک نہ تھا !

بوڑھے نے منوّر کی پیشانی پر بوسہ دیتے ہوئے جواب دیا

" میرے بچے میں یہ جانتا ہوں مگر لبتی والے نہیں جانتے اور جب کہ لبتی والے اصل حالت نہیں جانتے تیرا فرض ہے کہ تو میرے مرے ہوئے دوست اور ہم جولی کی عزت سے نہ کھیلے !

تجھے زبیدہ سے بیاہ کرنا ہو گا ۔ لبتی والوں نے اس کا سر تیری گود میں دیکھا ہے اور تجھے اب یہ سر عمر بھر اپنی گود میں رکھنا ہو گا ۔

اور میرے بچے ، زبیدہ بڑی اچھی بچی ہے وہ متاعِ گراں بہا اور سرمایہ عزیز ہے

اس میں وہ سب خوبیاں ہیں جو اس بستی کی پاکیزہ اور سادہ مٹی کسی عورت کو بخش سکتی ہے

اور پھر میں نے تیرے بڈھے باپ نے اس کی ماں سے اس کے مرے ہوئے

باپ کی رُوح کو شاید مان کر اس بچی کو تجھ سے منسوب کر دیا ہے اور اب کئی عزتوں کا سوال

ہے، اور میرے بچے تو نہیں جانتا، مگر مجھے علم ہے کہ میرا سر آج تک کبھی کسی ذلت کے

احساس سے جھکا نہیں ـــ اور اس بڑھاپے میں تو اس سر کو نہ جھکا۔"

اور یہ کہتے وقت شاہ جی بابا کی آنکھیں گنگا جمنی کی روانی کی طرح بہہ نکلی تھیں،

اور منور ان کے سینہ سے لگا، ایک ننھے بچے کی طرح سسکیاں بھرنے لگا تھا۔

اور باہر احاطہ کی مسجد کے مینار سے موذن فجر کی نماز کے لئے بستی والوں کو پکار

رہا تھا اور چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا،

سونے والو! جاگ اٹھو، نماز سونے سے بہتر ہے اور وہ اللہ جس نے تم

سب کو پیدا کیا، جو سب سے بڑا اور سب پر قادر ہے، تم سے اپنا حق مانگتا ہے۔

اور بستی کے بسنے والوں میں سے اکثر یہ پکار سن سن کر مسجد کی طرف بھاگنے لگے تھے۔

تیرھواں باب

منوّر بالکل اچھا ہو گیا تھا۔ اس کے سارے زخم بھر گئے تھے۔ اور آج رات ذیلدار کی حویلی اور اس کے وسیع و عریض باغ سینکڑوں گیسوں کی وجہ سے بقعۂ نور بنے تھے اور دس دس قدم کے فاصلے پر رکھے یہ گیس اپنی جلتی ہوئی زبانوں سے چیخ چیخ کر کہہ رہے تھے آج سرفراز صاحب سائرہ بی سے اور منوّر میاں زبیدہ بیگم سے بیاہے جا رہے ہیں۔ آج اس بستی پر آسمانوں کا خدا بہت مہربان تھا۔ بستی کے ایک ایک گھر میں چراغاں ہو رہے تھے اور ذیلدارنی نے اس اتنی بڑی خوشی پر ساری بستی کی عورتوں اور بچوں کو خوش رنگ کپڑے عطا کیے تھے۔ اس کی اپنی شادی کے بعد سے لے کر آج تک ایسا کوئی موقعہ نہیں آیا تھا۔ یہ پہلا موقع تھا جب خوشی کے ان گنت چاند اس پر طلوع ہو رہے تھے۔ وہ گھر بھر میں اس طرح کودتی پھر رہی تھی جیسے اس کا بوڑھا جسم پھر سے جوان ہو گیا ہو۔ وہ محبّت کرنے والی ماں تھی۔ اس کے گھر کے چراغ تو صرف یہی دو تھے۔ وہ کتنے لمبے اور ختم نہ ہونے والے سالوں سے اپنے ان بچّوں کو بیاہنے کی آرزو کر رہی تھی۔ اس آرزو کی تکمیل آج ہو رہی تھی۔ اس نے اپنے سارے ارمان نکال لئے تھے۔ بستی کی عورتوں کی ٹولیوں کی ٹولیاں اس کے بخشے ہوئے خوش رنگ کپڑے پہن کر کھلے صحن میں اس طرح پھر رہی تھیں

جیسے سرفراز اور زبیدہ کی نہیں ان میں سے ہر ایک کی اپنی شادی ہو رہی ہے اور جن دونوں کی شادی ہو رہی تھی ان میں سے ایک تو جوانی کی آرزوؤں اور اُمنگوں کی آگ میں اس بری طرح تپ اور جل رہی تھی کہ اس کے سارے جسم سے شعلے نکل رہے تھے۔ اور پاس بیٹھی سہیلیوں کو یہ دلہن بنی زبیدہ آج سارے دنوں سے زیادہ خوبصورت معلوم ہو رہی تھی اس کا حسن آج خوب نکھر گیا تھا۔ موٹی موٹی لانبی لانبی آنکھیں مستی کے طوفان ابل رہی تھیں اور چہرہ پر تو ہزار قیامتیں اور ہزار فتنے تڑپ رہے تھے۔ مگر نہ جانے کیا بات تھی وہ اس طوفانِ مسرت میں آج عجیب کھوئی کھوئی سی تھی شاید ابھی اسے اپنی خوش نصیبی اور کامرانی کا پورا یقین نہیں ہوا تھا۔ یا وہ اپنے دل و دماغ اور جسم پر آج کی رات میں ہجوم کرنے والی برکتوں اور خوشیوں کا تصور کر کے گھبرا گئی تھی۔ یہ ساعتِ بہار جو ہر جوان لڑکی کی زندگی میں صرف ایک بار آتی ہے۔ کتنی فتنہ ساماں ہوتی ہے۔ زبیدہ کو گو اس کا تجربہ نہ تھا۔ مگر اس کا دل بار بار اُوپر کو اُٹھتا اور نیچے کو گرتا جوان سینہ ابھی اس رات کی لذتوں کو نہیں بھولا تھا جب وہ جھاڑیوں میں اُلجھی تھی اور منور نے اسے اپنے بازوؤں میں سمیٹ کر باہر نکال لیا تھا۔ اس وقت تو اس کے جسم میں کانٹے چبھے تھے۔ خون رس رہا تھا اور زخموں میں ٹیس پڑ رہی تھی مگر ان ٹیسوں کے باوجود اس کی رُوح نے منور کے بازوؤں میں سمٹے ہوئے ایک عجیب لذت پائی تھی۔

اور آج کی رات جب کہ اس کے جسم میں کوئی ناسور نہ تھا کہیں کوئی کانٹا نہیں چبھا تھا وہ جب منور کے بازوؤں میں سمٹنے والی تھی، اس کی رُوح کیسی لذت پائے گی۔ اسے کیسا کیف ملے گا۔ زبیدہ ابھی تک یہی بات سوچ رہی تھی اور یہی بات بار بار سوچ سوچ کر وہ کچھ پاگل سی ہو گئی تھی۔ اسے اپنے دماغ پر ایک جنون سا طاری محسوس ہو رہا تھا

اور اس کا جی چاہ رہا تھا اس کے چاروں طرف پھیلے یہ سارے ہنگامے اچانک سو جائیں ۔ گیس جلنا چھوڑ دیں ، پاس بیٹھی لڑکیاں اور عورتیں ، گاتی ہوئی ڈومنیاں اور میراثنیں ۔ اور ان کی ڈھولکیں اور ان کے بجتے ہاتھ ..... سب آپ ہی آپ کہیں گم ہو جائیں ۔ اور وہ اپنے پلنگ پر سو جائے ، آرام کرنے لگے ۔ آنکھیں میچ لے اور پھر ایک عجیب قسم کا سایہ ــــ اس کے پلنگ کے قریب آن کر اسے ایک عجیب طرح کی میٹھی آواز میں پکارے ۔

" ہماری زبیدہ ، اچھی زبیدہ ، ہماری دلہن ۔ ہماری محبوبہ ۔ ہماری جانِ آرزو ، ہمارا سرمایہ حیات ، ہماری خوشی اور ہمارا سکون ۔ ذرا آنکھیں کھول لے اور دیکھ لے ــــ ہم تمہارے دولہا ہیں اور ہمارا نام منوّر ہے ۔"

مگر زبیدہ کے اس جنون کی کون پرواکرتا تھا ، ڈومنیوں کے گیت پہلے سے زیادہ شوخ اور تیز ہوتے جا رہے تھے اور شہر سے آیا ہوا بینڈ باجہ بڑے جوش کے ساتھ سرفراز کی برات کی روانگی کا اعلان کرنے لگا تھا ۔ دفعتاً زبیدہ کے سر سے سارا جنون اُتر گیا وہ اپنی جگہ سے اُٹھ کھڑی ہوئی اس کا جی چاہا ، اے کاش پہلے اس کا نکاح ہوتا اور پھر سرفراز کی برات جاتی ، مگر سرفراز بڑا تھا اور وہ چھوٹی تھی اور اس خیال کے آتے ہی وہ اپنی اِس بے ہودہ خواہش پر گھبرا گئی ۔

اور باہر آتش بازی چھٹنے لگی ۔ ہوائیاں شوں شوں کرتی آسمان کی طرف پرواز کرنے اور فضا میں شرارے ہی شرارے پھیلا رہی تھیں ــ اور پھر یک بیک گولے پھٹنے لگے ۔ اور اس کے آس پاس بیٹھی سہیلیاں شور مچانے لگیں ۔

" اری بی زبیدہ ذرا کھڑکی سے مُنہ نکال کر باہر تو دیکھیو تمہارے بھیّا پر اس وقت کتنا جوبن ہے ۔ وہ کیسا پیارا دولہا نظر آتا ہے ۔ اور سہروں نے اس کے جوان چہرہ پر کیسا

نور پھیلا دیا ہے۔

اور بی زبیدہ اپنے سارے احساسات بھول کر اس وقت محض ایک بہن بن گئی۔ آج کی رات بیاہے جانے والے سرفراز بھیّا کی بہن۔ اس نے کھڑکی میں سے باہر کو جھانکا سرفراز گھوڑے پر سوار ہو گیا تھا۔ اس کا منہ کھڑکی کی طرف تھا۔ دونوں بہن بھائیوں کی نگاہیں ایک دوسرے سے ملیں اور دونوں کے ہونٹوں پر عجیب ملکوتی مسکراہٹیں کھیل گئیں اور ابھی زبیدہ کی آنکھیں بھائی کے چہرے پر جمی تھیں کہ شاہ جی بابا نے منوّر کو سہارا دے کر سرفراز کے پیچھے سوار کر دیا۔

اور ــــ زبیدہ کی آنکھیں چندھیا گئیں۔ ہونٹوں پر پھیلی ہنسی شعلوں میں تبدیل ہو گئی اور ــــ اس نے اپنا منہ پھیر لیا۔ اور شاہ جی بابا کی زوردار آواز آپ ہی آپ فضا میں گونجی "بیٹے سرفراز! خدا کا نام لے کر گھوڑے کو آگے بڑھا دو"

آگے آگے گولے چھٹتے، اور ہوائیاں بڑی تیزی کے ساتھ فضا میں شرار سے چھوڑتی جا رہی تھیں اور پیچھے برات رواں تھی۔ خوشبوؤں کا ایک طوفان تھا، یا ایک سیلاب مسرّت جو بستی کی بڑی سڑک پر بڑھتا سائرہ، صابرہ اور زہرہ کے مکان کے قریب آن رُکا۔

اور بی فاطمہ کی تینوں بیٹیاں، سائرہ، صابرہ اور زہرہ بی رابعہ، مریم بی اور کئی اور سہیلیوں کے جھرمٹ میں بیٹھیں گولوں کو چھٹتے اور ہوائیوں کو شور مچاتے سُن رہی تھیں۔

سائرہ دلہن بنی تھی، مگر اس کے دل کے نہاں خانہ میں آج کوئی خوشی نہ تھی کوئی مسرّت اور کوئی آرزو اور اُمنگ نہ تھی وہ تو صبح سے لے کر دلہن بننے کے وقت تک آنسو بہاتی رہی تھی اور اپنی اندھی بہن صابرہ کو اپنے سینہ سے بار بار لگا کر بہت دھیمی

اور روتی آواز میں کہتی رہی تھی

" میری پیاری، اس میں میرا کوئی دوش نہیں، مجھے اس بیاہ پر کوئی خوشی نہیں ہے۔ میں تو محض مجبور ہوں۔ شاہ جی بابا نے میرے گلے میں یہ طوق زبردستی پہنا دیا ہے "

اور بی صابرہ نے کسی بار بھی کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ اور وہ تو رو بھی نہیں رہی تھی اس کی موٹی موٹی اندھی آنکھیں تو شاید رونا بھول ہی گئی تھیں اور شاید دل کے احساسات اور جذبات بھی اس کی آنکھوں کی بینائی کی طرح اس سے چھین گئے تھے کہ اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کے سینہ میں دل نہیں پتھر رکھا ہے۔ بے حس اور کھردرا پتھر۔ البتہ یہ پتھر آج دن بھر اسے چبھتا رہا تھا۔ اور وہ سوچ رہی تھی وہ بھی کیا ہے۔ مٹی کا ایک بے بس پتلا بے چارگی کی ایک مہمل تصویر، قدرت کو اس کے پیدا کرنے کی ضرورت کیا تھی۔ مگر اندھی صابرہ نہیں جانتی تھی کہ قدرت کے اس وسیع کارخانہ میں محض وہی ایک مٹی کا بے بس پتلا اور بے چارگی کی مہمل تصویر نہ تھی یہاں تو کروڑوں اس جیسے بُت تھے اور بہت حساس تھے ان کے سینوں میں بت ہونے کے باوجود دھڑکتے اور لرزتے دل تھے۔ مگر قدرت نے انہیں پیدا کیا تھا اور پیدا کر کے اپنے اس وسیع کارخانے کے قحبہ خانوں، بھٹیارخانوں، شراب خانوں، ناٹکوں ہنڈولوں اور تپتی گھروں میں رکھ دیا تھا، کہ وہاں اس کے بھاگتے دوڑتے اور اچھلتے کودتے، شوخ و مغرور بدماغ اور بدنہاد آدم زادے آئیں اور ان بے بس اور بے چارہ کھلونوں سے کھیلیں۔ انہیں بگاڑیں، انہیں توڑیں اور اپنی بہیمیت کو تسکین دیں، اور قدرت وسیع آسمانوں، شاداب سبزہ زاروں، گنگناتی ندیوں اور لہلہاتے کھیتوں کی کونپلوں پر کھڑی ــــــ اپنے ان جانوروں کی بہیمیت کا تماشا کرے۔

اندھی صابرہ کچھ بھی نہ جانتی تھی وہ تو اپنی دلہن بنی بہن کے پاس بیٹھی، ابھی تک

یہی سوچ رہی تھی کہ وہ مر کیوں نہ گئی، مگر موت بھی تو اس کے بس میں نہ تھی۔ ویسے ہی جیسے کہ یہ بات اس کے بس میں نہ تھی کہ وہ اپنی موٹی موٹی آنکھوں میں نور بھر کر ایک بار اپنی اس دلہن بنی ماں جائی سائرہ کو دیکھ لے اور کتنی سادہ تھی، کتنی بھولی تھی یہ صابرہ وہ اس وقت جب کہ فضا میں ہوائیاں شور مچا مچا کر مسرتوں کے گیت گا رہی تھیں صرف اتنی سی بات چاہ رہی تھی، دعائیں مانگ رہی تھی اور اپنے رب سے التجائیں کر رہی تھی، اے ہر چیز پر قادر خدا مجھے چند ساعتوں کے لئے بینائی عطا کر دے کہ میں اپنی اس ماں جائی بہن کو دلہن بنی دیکھ لوں۔

مگر یہ صابرہ کا بھولا پن ہی نہیں احمق پن تھا کہ وہ ایسی ناممکن بات چاہ رہی تھی۔

برات ان کے دروازہ پر پہنچی کھڑی تھی۔ بینڈ باجہ ایک طوفان اٹھا رہا تھا اور طوفان اٹھاتے اٹھاتے دفعتاً سو گیا۔ آتش بازی رک گئی ——— اب صرف شہنائیاں ہی شہنائیاں بج رہی تھیں اور ایسا معلوم ہونے لگا تھا جیسے یہ شہنائیاں اور ان کو بجانے والے راگنیوں میں تبدیل ہو گئے ہیں۔

اور زہرہ، رابعہ اور مریم اور ان کی دوسری ہم عمر لڑکیوں کو تو جیسے پر لگ گئے تھے۔ شہنائیوں سے اٹھنے والی راگنیوں نے شاید انہیں تتلیاں بنا دیا تھا ——— کہ وہ اس طرح اچھل اور کود رہی تھیں جیسے وہ مٹی سے بنے ہوئے آدم کی نہیں محض ہوا اور آگ سے بنی ہوئی حوا کی اولاد ہیں، قہقہوں کا سمندر تھا جو ان کے گلوں سے نکل نکل کر فضا میں تحلیل ہوتا جا رہا تھا۔ گیتوں کے بجرے تھے کہ ان کے آتشیں ہونٹوں سے نکل نکل کر کچھ عجیب طرح ناچتے شراروں کی صورت میں تبدیل ہو ہو کر براتیوں کے کانوں کے آس پاس پرواز کر رہے تھے۔

سب سے پہلے شاہ جی بابا اور بی ذیلدارنی نے اندر قدم رکھا۔ قاری صاحب نے

بڑی خوش الحانی کے ساتھ سورہ مریم کا ایک رکوع پڑھنا شروع کیا اور ابھی ان کی زبانِ مبارک سے پہلا لفظ ہی نکلا تھا کہ شہنائیاں مرگئیں۔ اور لڑکیوں کے گلوں سے اُٹھنے والے قہقہے اور گیت ذبح ہوگئے۔

شاہ جی بابا اور باقی براتی تو یہیں رُک گئے۔ سرفراز دولھا اور منور شاہ بالا گھوڑے سے اتر آئے اور قرات سننے لگے۔ البتہ ذیلدارنی جی اپنے کارواں سمیت اندر پہنچ گئیں اور دلہن بنی سائرہ کے سر پر سے چاندی کے سفید سفید چمکتے چمکتے روپوں کی بارش کرنے لگیں یہی تو ایک موقع تھا، دولت کے لٹانے کا اور پھر سامنے کوئی مدِمقابل نہ تھا۔ اس پاس پھیلی ساری کی ساری عورتیں بجز ان کے جو ذیلدارنی صاحب کے ساتھ آئی تھیں بستی کی کسان عورتیں تھیں۔ ان کسانوں کی بہوئیں۔ بیٹیاں اور بیویاں جو کڑکڑاتی دھوپوں اور پالے بھری راتوں میں اس ذیلدارنی کے کھیتوں میں ہل چلاتے اور انہیں پانی دیتے تھے۔

ذیلدارنی نے آج گیارہ سو روپے اپنی تھیلیوں میں بھرے تھے۔ بڑی ڈومنی ایک ایک کرکے یہ تھیلی ذیلدارنی کے ہاتھ میں دیتی جاتی اور ذیلدارنی انہیں بی فاطمہ کی یتیم بیٹی بی سائرہ کے سر پر سے نچھاور کررہی تھی۔ بھولی سائرہ کے سارے آنسو خشک ہوگئے تھے روپوں کی چھنچھناتی آواز نے، اس کے جسم کی ایک ایک رگ اور نس نس کو نغمہ میں تبدیل کردیا تھا۔

اور بی زہرہ تو ایسی شوخی پہ اُتر آئی تھی کہ اس نے بی ڈومنی کے ہاتھ سے ایک تھیلی چھین لی تھی اور چمکتے ہوئے روپوں کو وہ ذیلدارنی کے سر پر سے نچھاور کرنے کا شغل فرمارہی تھی، اور ساری لڑکیاں اور عورتیں کشتِ زعفران بن گئی تھیں اور بی ذیلدارنی تو اتنی خوش ہوئی تھی کہ اس نے روپے برسانے کا کام چھوڑ کر بی زہرہ کو گود میں اٹھالیا تھا

اور اس کے سر، پیشانی اور مُنہ کو چُوم چُوم کر اس کے گالوں کو انگاروں کی صورت میں تبدیل کرنے لگی تھی، اور روپوں کو لوٹتی کسان عورتیں بی ذیلدارنی کے اس کھیل سے اُکتا کر بہت بُری طرح چاہ رہی تھیں کہ روپوں کی بارش کا کام پھر شروع ہو جائے۔

اور ذیلدارنی شاید ان کی آنکھوں کی بے بسی کو پا گئی تھی کہ اس نے زہرہ کو چھوڑ دیا اور پھر روپے برسانے لگی۔ وہ سائرہ پر سے روپے برسا رہی تھی اور بی زہرہ اس پر سے —— گیارہ سو روپے ختم ہو گئے اور بی رحیمن نے بیچ میں کھڑے ہو کر بڑے فخر کے ساتھ پکارا

"بی بیو! ہماری بچی کا جہیز دیکھ لو"

اور ذیلدارنی کی رشتہ دار عورتوں کو یہ سُن کر ایک اچنبھا سا ہوا۔ وہ تو سمجھی تھیں۔ سائرہ کی ماں مری ہوئی ہے اور کوئی دوسرا ہے نہیں اسے جہیز میں کیا ملے گا —— مگر جب وہ بی رحیمن کے ساتھ بڑے کمرہ میں پہنچیں تو ان کی آنکھیں چندھیا گئیں۔ بڑی دری پر اکاون جوڑے بڑی ترتیب کے ساتھ بچھے پڑے تھے۔ اور ایک بڑے سے آبنوسی تھال میں سونے کی اکیس چوڑیاں، گلوبند اور مالا اس طرح چمک رہی تھی جیسے وہ چمک چمک کر ذیلدارنی کی، رشتہ دار عورتوں کی آنکھوں کو چندھیا دینا چاہتی ہو اور ذیلدارنی کی بہن تو صبر نہ کر سکی، اور بی رحیمن کو قریب کرکے پوچھ ہی لیا

"یہ اتنی چیزیں کہاں سے آئیں؟"

اور بی رحیمن نے بڑے فخر کے ساتھ جواب دیا۔

"یہ سب شاہ جی بابا کی مہربانی ہے۔"

ذیلدارنی نے بھی یہ بات سن لی اور اس کے چہرے کی جھُریاں یک بیک چہرے کی جلد میں چھپ گئیں، اس کے دونوں ہاتھ فضا میں اُٹھ گئے اور وہ بڑبڑانے لگی:۔

" میرے شاہ جی بابا اور میرے منوّر کی خیر۔

اور یہ شاہ جی بابا اور منوّر بہادر باہر صحن میں بچھی ہوئی چارپائیوں پر براتیوں کو بٹھا رہے تھے۔ شاہ جی بابا کتنے خوش تھے۔ ان کی لمبی لمبی سفید داڑھی نور میں دُھلی ہوئی معلوم ہو رہی تھی اور بوڑھی آنکھیں تو جوان بن گئی تھیں، مگر یہ منوّر کتنا چُپ چُپ تھا، اس کی آنکھیں کتنی گُنگ تھیں، اور یہ وہ آنکھیں تھیں جو ہمیشہ چمکتی رہتی تھیں اور رابعہ انہیں دیکھ کر کہا کرتی تھی، لوگ تو مُنہ سے بولتے ہیں مگر اس شریر کی آنکھیں باتیں کرتی اور گاتی ہیں۔ مگر اس کی آنکھوں میں ہمیشہ تڑپتے اور مچلتے رہنے والے راگ اس وقت سوئے پڑے تھے اور سرفراز کتنا مسرور تھا اور بار بار اس کا ہاتھ پکڑ پکڑ کر اس کے کان میں سرگوشی کر رہا تھا۔

" بھیا منوّر ـــــ آج شاہ جی بابا کتنے خوش ہیں۔

اور منوّر بابا کے چہرہ کی طرف دیکھ دیکھ کر نہ جانے کیوں پہلے سے زیادہ کھو جاتا۔

قاضی جی بڑے تخت پوش پر تشریف لے آئے اور شاہ جی بابا نے ایک عجیب مسرّت کے ساتھ سرفراز کا ہاتھ پکڑ کر اسے چارپائی پر سے اٹھایا۔ اور تخت پوش پر بٹھا دیا۔ سرفراز منوّر کو بھی اپنے ساتھ گھسیٹ لایا تھا مگر شاہ جی بابا نے ہنس کر اسے وہاں سے اُٹھا دیا تھا۔ اور ہولے سے کہا تھا

" نہیں بیٹا یہ مسند صرف تمہاری ہے ـــ اور منوّر میاں کی مسند تو تمہارے ہاں بچھی ہے"

اور بابا کی یہ بات سُن کر منوّر کی آنکھیں اچانک دھندلی ہو گئیں مگر اس نے اپنے دونوں ہاتھ اپنے سینہ پر رکھ کر شاید دل سے اُٹھنے والے آنسوؤں کو دبا دیا تھا کہ یہ آنکھوں کی طرف پرواز نہ کر سکے۔ اور قاضی جی نے کھنکھناتی مٹی کی سی آواز میں شاہ جی بابا کو حکم دیا:-

شاہ جی بابا ذرا دو گواہوں کو ساتھ لے کر بچّی سے پُوچھ تو آیئے اور شاہ جی بابا، خدا بخش کسان اور غلام محمد چوکیدار کو ساتھ لے کر برآمدہ پھاند کر بڑے دالان کے دروازہ پر آن رُکے اور بلند آواز سے پوچھا

" کیا میں اندر آسکتا ہوں؟"

ذیلدارنی اور بی رحیمن کی خوش خوش آواز میں آئی :-

" جی شاہ جی بابا تشریف لائیے ۔

اور شاہ جی بابا اور ان کے ساتھی اندر پہنچے ۔ بہت سی عورتوں نے گھونگھٹ نکال لئے تھے اور شاہ جی بابا سائرہ کے دونوں کندھوں پر اپنے دونوں ہاتھ رکھے اور اس کے نازک نازک سر سے اپنا سر لگائے پوچھ رہے تھے :-

" کیوں میری بچّی، تیرا نکاح سرفراز احمد بن ضمیر احمد کے ساتھ کر دیا جائے، تجھے منظور ہے؟

انہوں نے یہ الفاظ ایک بار نہیں کئی بار دہرائے مگر سائرہ کو تو ایک عجیب چُپ لگی تھی اور ذیلدارنی اور بی رحیمن اس سے ہزار کہہ رہی تھیں " بیٹی سر ہلا دو، اور ہاں کہہ دو " مگر سائرہ کا نہ سر ہلا اور نہ زبان ـــــ اور یہ عالم دیکھ کر بی مریم نے بڑی شوخی کے ساتھ اپنی ماں بی رحیمن سے کہا :-

" امّی! منوّر کو بلاؤ، جب تک یہ بات وہ نہیں پوچھے گا، بی سائرہ ہاں نہیں کریں گی ۔"

اور بی رحیمن نے بڑی حیرت کے ساتھ یہ بات شاہ جی بابا سے کہہ دی اور وہ بہت زور کے ساتھ پکارے " منوّر بیٹا! ذرا اندر آئیو ۔"

اور منوّر ——— اندر کی طرف بڑھا کانپتا اور لرزتا ہوا۔ اور جب اس نے دلہن بی سائرہ کے قریب دوزانو بیٹھ کر بی سائرہ کے سر کے قریب اپنا سر لے جاتے ہوئے اس سے پوچھا

"کیوں آپا بی کیا تمہارا نکاح بھیّا سرفراز سے کر دیا جائے؟"

ابھی آپا سائرہ بی کی آواز جواب میں نہیں آئی تھی کہ منوّر کی نگاہ ساتھ بیٹھی صابرہ پر پڑ گئی۔ کتنی بے بسی چھائی تھی اس لڑکی کے چہرے پر اور دفعتاً ——— کیسے عجیب و غریب قسم کے آنسو اس کی موٹی موٹی آنکھوں سے نکل کر اس کے گالوں پر بہنے لگے تھے۔ منوّر کو ایسا معلوم ہوا جیسے زلزلہ آ گیا ہو۔ اور ابھی وہ اس زلزلے کے جھٹکوں میں جھول رہا تھا، کہ بی سائرہ کی کانپتی آواز سُنائی دی۔

"ہاں بھیا منوّر"

اور ساری عورتیں اس آواز پر مبارک سلامت کے نعرے مارنے لگیں اور خوشی کے اس عالم میں کسی کی نگاہ نہ صابرہ پر پڑی اور نہ کانپتے منوّر پر اُٹھی ——— اور منوّر کانپتا لرزتا ——— باہر لوٹ آیا۔

مگر اس کے اندر ایک عجیب لاوا پھوٹ نکلا تھا اور یہ لاوا، اس کے ہوش و حواس کو جلاتا اس کے سینہ کی کمزور دیواریں توڑ کر باہر کی طرف بہہ نکلنے کے لئے مچل، اور تڑپ رہا تھا۔

قاضی جی نکاح پڑھا رہے تھے ——— اور جب انہوں نے نکاح پڑھا لیا، ——— تو مبارک سلامت کا ایک شور اُٹھا۔ چھواروں اور مکھانوں کی بارش ہونے لگی۔

اور اندر دلہن کی سہیلیاں خوشی کے گیت گانے لگیں اور میراثنوں نے ڈھولک پر تھاپ دی، اور دلہن کے سسرال اور اس کے ساجن کے گیت گانے لگیں۔

باہر کھانے کی دیگیں بجنے لگی تھیں ، اور چارپائیوں پر بیٹھے ہوئے براتی لمبے لمبے ہاتھوں سے پلاؤ اور زردے کی پلیٹیں صاف کر رہے تھے۔

اور منوّر ان سب کی نظروں سے بچتا چُپ چاپ پچھلی گلی میں آن کھڑا ہوا تھا اور اس کا ضمیر اس کے دِل کے کان میں چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا۔

" کمینے آخر تو بھی تو وہی روش چلا ، جو اس دُنیا کے عام لوگوں کی روش ہے۔ یہ بھی تو ماں باپ اور حالات کی مجبوریوں کی پناہ لے کر کمزور اور بے چاری لڑکیوں کی عمر خراب کر دیتے ہیں اور تُو تو اپنے باپ کا کہا مان کر ایک بہار اندر بہار ایک چمن اندر چمن جوان اور رعنا امیر لڑکی کو اپنی زندگی کی گود میں بھر کر ہر رات اور اس کے ہر حصّہ میں ، ہر دن اور اس کی ہر ساعت میں مسرّت کا جھولا جھُولے گا۔ تیری رُوح نو گانے لگے گی۔ اور تیرا جسم نو رقصِ بہار کی صورت اختیار کرے گا۔ مگر اس اندھی لڑکی کا کیا ہو گا ؟

اس نے اپنے ضمیر کی یہ آواز سُن لی اور وہ بُری طرح کانپ اُٹھا۔ اور پھر جیسے اچانک اس کے جسم کو کوئی بجلی چھُو گئی ——— وہ اس گلی میں آگے ہی آگے بڑھنے لگا۔ بڑی سڑک آ گئی اور جیسے ہی یہ بڑی سڑک آئی ، منوّر پاگلوں کی طرح بھاگ نِکلا اور سِرو پہاڑی کے اُوپر پہنچ کر اندھیری رات کے دامن میں جا چھپا۔ اور اب اس کا ضمیر خاموش تھا۔ اور اس کے دل کی پیٹھ پر تھپکیاں دے رہا تھا۔

اور اِدھر جب ڈولی صحن میں آن پہنچی اور ذیلدارنی نے غلام محمد چوکیدار کو پکارا کہ بھیا منوّر سے کہے ، " اپنی آپا کو ڈولی میں سوار کرے۔ " تو منوّر کو ہر طرف ڈھونڈا جانے لگا لوگ اِدھر اُدھر بھاگ رہے تھے ، مگر منوّر کو کہیں نہ پا کر پھر لوٹ آئے تھے۔ اور برات کی

ساری خوشی ایک عجیب ماتم بن گئی تھی۔ اور سرفراز تو مسند پر سے اُٹھ کر صحن میں اس طرح ٹہل رہا تھا جیسے وہ اس بے عزتی کا بدلہ سارے جہاں سے لینے پر تل گیا ہو۔

ذیلدارنی بھی صحن میں نکل آئی تھی اور شاہ جی بابا کے سر پر کھڑی چیخ رہی تھی۔

" شاہ جی بابا اب کیا ہوگا؟ "

اور شاہ جی بابا اپنے دونوں بوڑھے ہاتھ اپنے سر پر رکھے برآمدہ کے ستون سے لگ گئے تھے ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے ان کی کمر دوہری ہوگئی ہے اور ہمیشہ اونچا رہنے والا سر اس بڑھاپے میں بہت بُری طرح جُھک گیا ہے۔

اور اندر دلہن بنی سائرہ ، صابرہ اور زہرہ اس طرح چیخ رہی تھیں جیسے انہیں انگاروں پر لوٹایا جا رہا ہو۔

چودھواں باب

اور لگلے منور نے اپنے ضمیر کو تو آلودہ کر لیا تھا۔ مہرہ پہاڑی پر پھیلے جنگل میں آوارہ و سرگردان پھرنے کا ارادہ کرتے اس کا ضمیر تو خوش ہو گیا تھا، مگر احمق نے یہ نہ سوچا کہ اس طرح اس نے زبیدہ، ذیلدارنی، شاہ جی بابا، اور خود صابرہ اور سائرہ پر ہزار دوزخ مسلط کر دیئے تھے وہ تو اپنے دماغ کے کچے پن کے باعث یہ سمجھ بیٹھا تھا کہ اس طرح اپنی خواہشات اور مسرتوں کی قربانی کر کے، وہ کوئی بڑا کام کر رہا ہے۔ عام آدمیوں کی طرح، احمق اور پاگل آدمیوں کی طرح وہ اپنے نفس کی خواہش مار کر نروان اور تسکین پانا چاہتا تھا۔ اس کو یہ غلط فہمی تھی کہ آدمی اپنی خوشیاں قربان کر کے کوئی بڑا کام کرتا ہے۔ حالانکہ یہ کوئی قربانی نہ تھی، یہ تو عذاب تھا اس کی اپنی ذات کے لئے بھی اور ان بدنصیبوں کے لئے بھی جو اس احمق سے وابستہ تھے۔

اور پہلے تو اس سے صرف اندھی صابرہ اور شاہ جی بابا ہی وابستہ تھے اور اب اس وابستگی کا دامن تو بہت پھیل گیا تھا۔ اور غریب زبیدہ، ذیلدارنی اور سرفراز بھی اس لپیٹ میں آ گئے تھے۔

سرفراز کو یقیناً ایک پری مل گئی تھی۔ یقیناً سائرہ سے بیاہ کر کے، اس کی روح میں ایک نئی راگنی چھڑ گئی تھی۔ لیکن سرفراز محض جوان مرد ہی نہ تھا۔ وہ بھائی بھی تھا۔ اور اس رات

جب وہ سائرہ کو بیاہ کر لایا، اور زبیدہ دلہن بنی بن بیاہی رہ گئی، تو ایک بھائی کی حیثیت سے اس کا کلیجہ چھلنی ہوگیا۔ اس کا دماغ کھول اٹھا اور اس کا جی چاہا۔ وہ ساری فضاؤں کی وسعتیں سمیٹ کر اس منور کو اپنی گرفت میں لے لے اور اسے ایسا ہولناک عذاب دے کہ دنیا لرز اٹھے۔

اس نے تو اس کے خاندان کی ناک کاٹ لی تھی۔ اس نے تو بیاہ کی رات اس کی دلہن بنی بہن سے منہ موڑ کر ساری دنیا سے چیخ چیخ کر کہہ دیا تھا۔ یہ زبیدہ بیگم بنت ضمیر احمد ذیلدار بڑی آوارہ اور ناپاک لڑکی ہے۔ اور میں یہاں سے اس لئے بھاگا ہوں کہ میری غیرت اس کی ناپاکیوں کو برداشت نہ کر سکتی تھی!

اور یہ کتنا بڑا طوفان تھا، جو اس نے اٹھایا تھا۔ اس نے تو اپنی اس حرکت سے خوشیوں بھرے گھر پر ہزاروں غم برسا دیئے تھے۔ اور ایسے آدمی کو وہ کبھی معاف نہ کر سکتا تھا تیسرے دن اس نے خدا بخش، مہرو، عمردین اور نھتو کو خوفناک قسم کے گنڈاسے اور اپنی نئی رائفل دے کر حکم دیا، ہر پہاڑی پر پھیلے جنگل کے ایک ایک کنج، ایک ایک موڑ اور ایک ایک غار کو چھان ڈالو، اور اس کمینے کو پکڑ کر رستہ بھر اس کی پیٹھ پر ڈنڈے برساتے میرے پاس لاؤ، مگر مریم اور سائرہ نے، جو اس حکم کے وقت سرفراز کے پاس موجود تھیں، یہ خبر زبیدہ رانی سے جا کہی ـــــ زبیدہ رانی اس حادثہ کے وقت سے لے کر اب تک چپ سادھے تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ دفعتاً گنگی ہوگئی ہے۔ اور زبان کا کام محض رونی آنکھوں سے لینا چاہتی ہے، مگر یہ خبر سن کر جیسے اس کی بند زبان دفعتاً کھل گئی ہو۔ اور وہ بری طرح چیخ اٹھی:۔

"اے میرے ماں جائے بھائی، منور کو یہ سزا نہ دے، میں تجھ سے کیسے کہوں ـــــ وہ میرا معبود ہے۔"

اور سائرہ اور مریم کو یہ الفاظ سن کر ایسا محسوس ہوا جیسے یہ زبیدہ اس زمین کی نہیں

کسی دوسری دُنیا کی مخلوق ہے۔ اور مریم تو سوچ رہی تھی اگر یہ منور میرے ساتھ یہ حرکت کرتا، تو میں آپ اس کے تعاقب میں جاتی اور اپنے دانتوں سے اس کے جسم کی ایک ایک بوٹی چبا جاتی شاید سائرہ اتنی سختی تو نہ کرتی مگر کچھ زیادہ نرمی بھی نہ برتتی ـــــ پر یہ زبیدہ تو کچھ بالکل ہی عجیب نکل آئی تھی ـــــ ان دونوں نے سوچا، ابھی اس زبیدہ اور منور میں رشتہ ہی کیا تھا۔

مگر وہ نہیں جانتی تھیں۔ وہ آنکھیں رکھنے کے باوجود اندھی تھیں۔ اگر ان کی آنکھیں صحیح بصیرت کی مالک ہوتیں تو زبیدہ کے چہرہ پر چھائی زردی اور متواتر بہنے والی آنکھوں سے یہ راز پا لیتیں۔ اور خیر اب تو انہیں بہت کچھ معلوم ہو گیا تھا، اور وہ دونوں یہ پیغام لے کر سرفراز کے پاس آئیں۔ دونوں اس کی چہیتیاں تھیں ـــــ مگر اس کے خون میں بھی ایک خاص قسم کی حرارت تھی اور یہ حرارت انتقام لئے بغیر اپنی خوراک نہ پا سکتی تھی۔ اس لئے اس نے ان دونوں کو ٹال دیا اور سمجھا دیا کہ زبیدہ سے جا کہیں، ہمارے آدمی منور پر کوئی سختی نہیں کریں گے اسے بڑے ادب کے ساتھ اس کے حضور کھینچ لائیں گے۔ اور پھر وہ جیسی سزا تجویز کرے گی، ویسی ہی دی جائے گی۔

اور جب مریم نے زبیدہ سے بھائی کی یہ بات کہی تو زبیدہ بُری طرح رونے لگی، اور سوچنے لگی، وہ منور کو سزا کیا دے گی، وہ کون ہوتی ہے، کبھی لونڈیاں، آقاؤں کو اور وہ بھی خداوندوں کو سزا دے سکتی ہیں، بھائی نے یہ کیسی گستاخانہ بات کہی ہے اور وہ تخیل ہی تخیل میں اپنے اس ہیرو محبوب سے معافی مانگنے لگی۔ اس کے دل نے اپنے عجیب غریب ہاتھ اس ذہنی تصویر کے سامنے جوڑ دیئے۔ وہ گاؤ تکیہ سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی۔ وہ ایک جھٹکے کے ساتھ اکڑوں بیٹھ گئی اور اپنے دونوں ہاتھ باندھ کر اپنی پیشانی گاؤ تکیہ پر ٹیک دی۔

یہ سجدہ سہو تھا زبیدہ کا اپنے بھائی کی طرف سے اپنے اس ہیرو محبوب کے حضور

میں جو اسے اس طرح چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ اور وہ سارے عالم میں رسوا ہو گئی تھی۔

مگر یہ زبیدہ تو اس سے بھی بڑی رسوائی برداشت کر سکتی تھی اور پھر اس کی ذاتی رائے میں یہ رسوائی نہ تھی۔ یہ تو عشق کی راہ کی پہلی منزل تھی۔ یہ تو ابھی اس کا کاروانِ محبت پہلی منزل پر اترا تھا ——— اور اس میں تو اتنا حوصلہ تھا کہ وہ ہر منزل پر ایسی ہی رسوائی اور ایسی ہی ذلت برداشت کر سکتی تھی۔ منور اس جوان لڑکی سے واقف نہ تھا۔ اگر اسے اس لڑکی کے قلب کی وسعتوں اور عظمتوں سے آگاہی ہوتی وہ کبھی اسے چھوڑ کر نہ جاتا۔ مگر اگر وہ اسے چھوڑ کر نہ جاتا تو زبیدہ کی عظمتوں کا پتہ ہی کیسے لگتا۔ سونے کی اصلیت تو اسی وقت معلوم ہوتی ہے جب وہ کٹھالی میں گر کر ٹپکتا ہے اور زبیدہ بھی کٹھالی میں پڑی تھی، اور یہ کٹھالی عشق کی کٹھالی تھی۔ اور سبحان اللہ کیا عشق تھا یہ جس پر ہزاروں پیغمبریاں اور ہزاروں صحیفے قربان کئے جا سکتے تھے۔

وہ خود ایک کبریائی تھی۔ ایک کبریا تھی۔ ایک بالکل نئی قسم کی دریافت تھی۔ اور ابھی تو اس کی عظمتوں کے چہرہ سے پہلا پردہ ہٹا تھا۔ کسی اور جوان لڑکی کو اس کا محبوب شادی کی رات بیاہ کے بغیر اس طرح چھوڑ کر چلا جاتا۔ تو وہ چیخ اور چلانے لگتی۔ گھر بھر میں ایک طوفان برپا کر دیتی، مگر زبیدہ نے کسی سے ایک حرف تک نہیں کہا۔ حتیٰ کہ بوڑھی ماں کو، جو اس منور کو ہزار بددعائیں دے رہی تھی، اپنے سینہ سے قریب کر کے بہت دھیمی آواز میں سمجھایا:-

"ماں ——— میں بڑی خوش ہوں، مجھے کوئی شکوہ نہیں ہے، تم منور کو معاف کر دو۔"

اور بوڑھی ذیلدارنی نے اپنی اس عجیب غریب بیٹی کو بہت بُری طرح اپنے سینہ سے بھینچ لیا۔ اور زبان سے نہیں دل ہی دل میں اس منور کی بدنصیبی کو کوسنے لگی جس نے ایسی دولت سے منہ موڑ لیا تھا، مگر پانچویں رات جب شاہ جی بابا اور کئی اور آدمی، ہر و جنگل کی ایک ایک غار اور ایک ایک کھڈ کو دیکھ لینے کے بعد ناکام لوٹ آئے تھے تو شاہ جی بابا کے دل سے شاید

محبت پدری نکل گئی تھی، کہ انہوں نے —— بھری محفل میں زبیدہ کے سر پر اپنے دونوں لرزاں ہاتھ رکھ کر بہت زور دار آواز میں اس منور کو بد دعا دی۔

" منور —— خدا کرے تیرے جسم کے ایک ایک حصہ میں دس دس متعدی بیماریاں پرورش پائیں —— اور تیری عمر اتنی لمبی ہو جائے —— کہ تو ہزار سال تک مر نہ سکے "

اور زبیدہ نے —— شاہ جی بابا کی رانوں کے ساتھ سر لگا اور اپنا منہ اوپر کر کے اپنی آنکھوں میں اپنے وجود کا سارا عجیب پن بھر کر شاہ جی بابا سے التجا کی:۔

" نہ شاہ جی بابا! ایسی بد دعا نہ دیجئے، دعا کیجئے کہ خدا ان کو ہر قسم کی خوشی اور ہر قسم کا آرام عطا فرمائے "

اور شاہ جی بابا کی آنکھوں میں آنسو امنڈ آنے کو تھے مگر وہ رونا نہ چاہتے تھے۔ انہوں نے یہ آنسو روک لئے اور کسی قدر لرزتی آواز میں جواب دیا:۔

" زبیدہ بانو! وہ بد نصیب تجھ کو غمناک بنانے کے بعد کبھی خوش نہیں رہ سکتا خوشیوں اور مسرتوں کے خدا تو اسی رات اس سے روٹھ گئے تھے جب اس نے تجھ سے منہ موڑا تھا"

اور نہ جانے ذیلدارنی کو کیا ہوا، وہ چیخ چیخ کر رونے لگی۔ اس نے شاہ جی بابا کے دونوں ہاتھ پکڑ لئے اور اس بڈھے کے دل کی قوتِ برداشت کے خیال سے کانپ اٹھی۔

شاہ جی بابا، زبیدہ کی پیشانی چوم کر جب صابرہ اور زہرہ کے گھر کی طرف چل دیئے تو ذیلدارنی نے پاس بیٹھی رحیمن سے کہا:۔

"کتنا صبر ہے اس شاہ جی بابا میں، اور کیسی گہرائی ہے اس کے قلب میں۔ میں تو آج تک اسے سمجھ ہی نہ سکی تھی۔

اور ذیلدارنی تو سطحی عورت تھی وہ ان بڑے لوگوں کو کیا سمجھتی، یہ تو خدائی کے راز تھے

اور صرف شاہ جی بابا ہی نہیں اس کی اپنی بیٹی زبیدہ بھی ایک راز تھی۔ اور ذیلدارنی نے اسے جنم دینے اور دودھ پلانے کے باوجود سمجھ نہ پائی تھی اور اسے تو اس کی وہ خالہ بھی نہ سمجھ سکی تھی، جس نے دو سال کی عمر سے لے کر اٹھارہ برس کی عمر تک اسے پالا تھا —— اس سارے گھر میں سوائے سائرہ کے اس زبیدہ کی فطرت سے کوئی آگاہ نہ تھا۔ سائرہ بھی زیادہ آگاہ نہ تھی اور آج کی رات تک تو اسے بھی کوئی خاص علم نہ تھا۔ لیکن اس اندھیری رات نے اس زبیدہ کے بارہ میں اسے بہت کچھ بتا دیا۔

وہ سرفراز کے ساتھ کے پلنگ پر سوئی پڑی تھی —— اچانک اس کی آنکھ کھل گئی کمرہ میں تاریکی تھی، نئی نویلی دلہن تھی ڈر گئی اور سرفراز کی ساتھ ملی چارپائی پر ہاتھ مارنے لگی —— سرفراز تو چارپائی سے غائب تھا، وہ سہم گئی اور سہمی سہمی اپنے پلنگ سے اُٹھی دروازہ کے قریب پہنچی، کہ شوہر کو پکارے، مگر جیسے ہی وہ دروازہ کے قریب آئی۔ اسے ایسا محسوس ہوا جیسے اس کا شوہر کسی سے باتیں کر رہا ہے اور فریق ثانی کوئی عورت ہے۔ اس نے خواہش نہ ہونے کے باوجود دروازہ سے کان لگا دیئے، یہ تو مریم کی آواز تھی جو سہمی سہمی کہہ رہی تھی "مگر مالک اب یہ بات چھپائے سے چھپ نہیں سکتی"۔ اور یہ کہہ کر سسکیاں بھرنے لگی سرفراز نے اسے ڈانٹا۔

"مریم ہوش کرو، اگر سائرہ کو معلوم ہو جائے کہ تم یہاں آئی کھڑی ہو۔ اور تم اور مجھ میں ناجائز تعلق تھا جس کا نتیجہ اب ظاہر ہونے والا ہے تو کیا ہوگا"

مریم کی آواز کسی قدر بلند ہو گئی

"سرفراز! تم تو مرد ہو، تمہیں مصلحت اندیشیاں آتی ہیں۔ مگر میں تو عورت ہوں تمہیں تو کوئی کچھ نہیں کہے گا۔ مگر مجھے تو کوئی جینے نہ دے گا، اور میں اب جینا بھی نہیں چاہتی۔

ابھی تو ماں کو کچھ معلوم نہیں ہوا، اور جب معلوم ہو جائے گا تو وہ میرا گلا گھونٹ دے گی
سرفراز بابو! غریبوں کی بھی عزت ہوتی ہے۔"

سرفراز کے لئے آج یہ بالکل نئی عورت تھی، جو بول رہی تھی اس کا جی چاہا اسے اس زور کا دھکا دے کہ وہ اور اس کے پیٹ کا بوجھ لڑھکتے لڑھکتے کم سے کم دس قدم دور جا گریں، مگر ـــــ وہ جہاں کھڑے تھے وہ محفوظ جگہ نہ تھی۔ اگر وہ ایسا کرتا تو سارے گھر والے جاگ اٹھتے اور ایک قیامت کھڑی ہو جاتی، وہ کوئی قیامت برپا کرنے کی ہمت نہ رکھتا تھا۔ اس لئے اس نے مریم کا ہاتھ زور سے پکڑ کر اسے باہر کی طرف کھینچتے ہوئے کہا:-

"میں نے کہا یہاں باتیں نہ کرو۔ چلو باہر چلیں وہاں جو چاہے بکتی رہنا۔"

اور مریم نے اپنا ہاتھ چھڑاتے ہوئے پہلے سے کسی قدر بلند آواز میں جواب دیا، اور میں تو یہیں کہوں گی۔

اور سرفراز کی ساری مردانگیاں جاگ اٹھیں۔ اس نے اس کی کلائی بہت زور سے اپنے ہاتھ میں پکڑ لی اور قریب تھا کہ اسے، دور دھکیل دے۔ اچانک دروازہ کھلا اور سائرہ اس میں سے نکل کر ان دونوں کے سامنے آن کھڑی ہوئی، اور وہ دونوں سکتے میں آ گئے۔ سرفراز اپنی اس نئی نویلی دلہن سے بہت محبت کرنے لگا تھا، عشق کی حد تک اور یہ تھی بھی اس قابل ـــــ اور اس کا حسن تو اس ساری بستی میں اپنی مثال آپ تھا۔ اور یہ حسن تو سرفراز کے ساتھ بیاہ کرنے کے بعد خوب نکھر آیا تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے سائرہ حور سے پری بن گئی ہے۔ اور یہ پری ان دونوں کے سامنے کھڑی تھی ـــــ اور وہ دونوں دم بخود تھے اچانک یہ پری وہاں سے بھاگی۔ آپ ہی آپ بھاگ اٹھی۔ اور ان کے دیکھتے دیکھتے زبیدہ کے کمرہ میں جا پہنچی۔ پہلے تو وہ سہمے سہمے رہے، اب کانپنے لگے۔ مریم نے اسے اور اس نے مریم کو

دیکھا اور دونوں کچھ کہنا چاہتے تھے مگر کہہ نہ سکے ـــــ

اور ادھر جب سائرہ بی زبیدہ کے کمرہ میں پہنچی تو بی زبیدہ ابھی تک جاگ رہی تھی اس غریب کی نیند اُڑ چکی تھی ۔ وہ ساری ساری رات جاگتی رہتی اور موٹی موٹی آنکھیں بہتی رہتیں ۔ وہ تو ایک ایسے روگ میں مبتلا تھی جس میں نیند کوسوں بھاگتی ہے ۔ سائرہ جاتے ہی اس سے لپٹ گئی ۔ اور وہ حیران رہ گئی ۔ کہ آج اس کی اس سائرہ بھابی کو کیا جنون ہوا ہے اور جب سائرہ اس سے لپٹی سسکیاں بھرنے لگی ۔ تو اس کے اپنے آنسو رک گئے ۔ اور اس نے اس کی پیشانی کو چومتے ہوئے پوچھا ۔

" کیوں میری جان ! یہ تم کو کیا ہو گیا ہے ؟"

اور یہ جان قابو میں نہ تھی ۔ وہ سسکیاں بھرتی اور اس سے لپٹتی رہی ۔ اور زبیدہ بار بار اس کی پیشانی چومتی ، اور اس کے بالوں میں کنگھی کرتی رہی ، اچانک اسے آپ ہی آپ اس مریم کا خیال آگیا ۔ وہ جانتی تھی کہ یہ مریم سرفراز کے پاس آتی ہے ۔ اس نے خود کئی بار اسے سرفراز کے کمرہ سے نکلتے دیکھا تھا ـــــ اور جیسے ہی اسے یہ خیال آیا وہ کانپ اُٹھی ، اس نے سوچا " کہیں آج بھی سرفراز بھیا اس مریم کے پاس تو نہیں گئے ۔

اور یہ سوچتے ہی اس نے سائرہ کی مانگ میں ایک اور بوسہ دیتے ہوئے پوچھا ۔

" کیوں سرفراز بھیا اپنے کمرہ میں نہیں ہیں ؟"

اور سائرہ کی سسکیاں جیسے رُک گئیں اور عورت پن جاگ اُٹھا ۔ اس نے جواب دیا " جی وہ ـــــ نہ جانے کب سے باہر غسل خانہ کے قریب کھڑے اپنی اس چہیتی کو منا رہے ہیں ۔ اور وہ شور مچا رہی ہے ۔ کہتی ہے ' میں کہاں جاؤں ، میرا کیا ہوگا ـــــ میں تو دنیا میں منہ دکھانے کے قابل نہیں رہوں گی ۔

اور زبیدہ کا جسم آپ ہی آپ عجیب قسم کے ہچکولے کھانے لگا۔ پہلے اس کے ذہن میں یہ بات آئی ہی نہ تھی ـــــ اور یہ بات کتنی خوفناک تھی۔ اگر لوگوں کو معلوم ہو جائے گا ـــــ تو کتنی بدنامی ہوگی، اس کے خاندان کی ـــــ لوگ کہیں گے یہ بہن اور بھائی باپ کے مرتے ہی کس راہ پر چل نکلے ہیں۔ اور یہ لوگ تو اسے جینے نہیں دیتے تھے، حالانکہ اس نے کچھ کیا نہ تھا ـــــ اور سرفراز اور مریم تو بہت کچھ کر چکے تھے اور ان کا عمل تو اب ایک مادی شکل اختیار کر کے دنیا کے سامنے آنے والا تھا۔

زبیدہ ایک بار پھر کانپ اٹھی، اور پھر جیسے اسے بجلی چھو گئی ہو۔ وہ سائرہ کو وہیں چھوڑ کر باہر کی طرف لپکی، باہر تو کوئی بھی نہ تھا۔ مریم اور سرفراز دونوں کہیں گم ہو گئے تھے۔ سرفراز اپنے کمرہ میں تو نہیں تھا۔ زبیدہ بہت بری طرح ڈر گئی۔ وہ بہت ڈراؤنی سی باتیں سوچنے لگی، کہیں یہ سرفراز کچھ کر نہ بیٹھے۔ اس ڈر نے اس پر ایک عجیب دیوانگی سی طاری کر دی ـــــ وہ بھاگتی بھاگتی باہر کے برآمدہ میں جا پہنچی اور بہت زور سے سرفراز کا نام لے لے کر پکارنے لگی۔

"اے سرفراز ادھر آجاؤ، کہاں گئے ہو۔ سائرہ میرے پاس ہیں۔"

سرفراز احاطہ سے باہر تھا۔ اور مریم کو سمجھا رہا تھا۔ خدا کے لئے اب تو یہاں سے چلی جاؤ ورنہ میں یہیں اپنا گلا گھونٹ لوں گا۔ مریم عورت تھی۔ اور سرفراز سے محبت کرتی تھی اس دھمکی سے ڈر گئی۔ اور اس کے دونوں ہاتھوں کو چومتی ہوئی گھر کی طرف چل دی۔ اور سرفراز اندر کو لوٹا۔ زبیدہ ابھی تک پکار رہی تھی، اس نے سہمے سہمے یہ آواز سنی۔ اور جواب میں ٹارچ کی روشنی پھینکی ـــــ ورنہ یہ زبیدہ تو چیختی ہی جاتی اور ٹارچ کی یہ روشنی دیکھتے ہی زبیدہ اس کی طرف بھاگی اور اس کے پاس پہنچ کر اسے اسی طرح گلے لگالیا جیسے وہ

موت کے مُنہ سے بچا ہو ۔ اور سرفراز بہن کی اس بے تابی سے کچھ سمجھ نہ سکا ۔ البتہ اسے یہ بات ضرور معلوم ہو گئی ۔ کہ سائرہ نے بہن سے کوئی بات نہیں کہی اور یہ سائرہ اسے کتنی اچھی معلوم ہوئی اس کا جی چاہا بہن کو پرے ہٹا کر ـــــ بھاگتا ہوا جائے اور اس سائرہ سے لپٹ جائے ۔

وہ دونوں بہن بھائی ایک ساتھ لپٹے ـــــ بڑے برآمدہ تک آئے ۔ زبیدہ نے دروازہ کے قریب کھڑے ہو کر سائرہ کو آواز دی ۔ سائرہ ابھی تک رو رہی تھی ۔ مگر زبیدہ کی آواز سُن کر چارپائی سے اُٹھ بیٹھی ۔ اور جب زبیدہ کے ساتھ سرفراز کو دروازہ میں کھڑا پایا ، تو پھر لیٹ گئی ۔ وہ اپنے اس ساجن سے روٹھ گئی تھی جو ایسی ایسی حرکتیں کرتا رہا تھا ۔ دونوں بہن بھائی ایک ساتھ کمرہ میں داخل ہوئے ، سائرہ انہیں دیکھ کر اور زیادہ کٹ گئی ۔ نہ جانے یہ زبیدہ کیا چیز تھی ، سائرہ کو گدگدانے لگی ـــــ اور جب پگلی سائرہ ہنس دی تو اس کا ہاتھ بھائی کے ہاتھ میں دیتی ہوئی بولی ۔

" لو بھیا ـــــ پکڑ لے جاؤ اس شریر کو ۔"

اور سائرہ شرما گئی اور جلدی جلدی اُٹھ بیٹھی ، اور زبیدہ کی طرف کچھ عجیب طرح دیکھتی ہوئی کمرہ سے باہر نکل گئی ۔

اور زبیدہ پلنگ پر اس طرح گر پڑی جیسے ، اسے اچانک زلزلہ کے کسی جھٹکے نے چھو لیا ہو ۔ اور زلزلہ کا یہ جھٹکا ، تو اس کے جسم کی رگ رگ اور نس نس کو لرزا کر اس کے دل کے ہر قطرہ خون کو تڑپانے لگا تھا ۔

اور نہ جانے کیسے ، بھائی اور بھاوج کی یکجائی کے تخیل سے اس کا مرغِ خیال اپنے روٹھے ارمانوں اور مچلتے ہوئے جذبات کے دھارے پر بہنے لگا ۔ اور وہ روتی آنکھوں اور

لرزاں دل کے ساتھ سوچنے لگی۔ اگر اس کی تقدیر اچھی ہوتی، اگر اونچے اونچے آسمانوں، تڑپتی اور کوندتی بجلیوں، آندھیوں اور طوفانوں کا خدا اس پر مہربان ہوتا، تو آج —— اس کی نہ ترساں اور ہراساں آغوش تہی نہ ہوتی، اور اس کا ذہنی محبوب اس کے جسم سے قریب ہوتا —— وہ سوچنے کو تو یہ بے ہودہ خیال سوچ گئی۔ مگر جیسے اسے اپنے اس بے ہودہ خیال پر آپ ہی آپ شرم آنے لگی ہو۔ اس نے اپنا منہ اپنے دونوں ہاتھوں میں چھپا لیا اور سسکیاں بھر بھر کر رونے لگی۔

اور یہ سسکیاں لمحہ بہ لمحہ زور پکڑنے لگیں۔ جب سے منوّر غائب ہوا تھا۔ وہ آج تک اس بے بسی کے ساتھ روئی نہ تھی۔ مگر آج تو جیسے اس کے ضبط کی ندی بند توڑ کر بہت زور شور سے بہہ نکلی تھی۔ اور یہ خیال ہی نہ رہا تھا، کہ اپنے محبوب کی خاطر اس طرح رونا اس جیسی انوکھی عورت کو زیب نہیں دیتا۔

وہ روتی ہی گئی، اور رات اپنا دامن سکیڑتی، اور شاید اس کے ساتھ ساتھ اسی شدّت کے ساتھ روتی بھاگتی رہی۔

پندرھواں باب

اور جب صبح بارہ بجے کے قریب اس کی آنکھ کھلی تو شرماتی لجاتی سائرہ کو اپنے پلنگ پر بیٹھے پایا۔ رات بھر شاید اس کے شوہر نے اس کے ساتھ بہت زیادہ گستاخیاں کی تھیں کہ اس کا نازک نازک سا جسم، ابھی تک شرما اور کپکپا رہا تھا۔ اور اس کی لانبی لانبی موٹی موٹی آنکھیں عجیب قسم کی شرم سے جھکی جا رہی تھیں۔

زبیدہ اس معصوم اور شرماتی لڑکی کی فطرت سے واقف تھی اسے علم تھا کہ بی فاطمہ کی یہ بیٹی محض گاؤ دم ہے۔ محض ایک شریف سید زادی ہے اور کچھ نہیں۔ اور جیسے ہی زبیدہ نے سائرہ کو سکڑے سکڑے اور شرمائے شرمائے اپنے پلنگ پر بیٹھے دیکھا، تو جلدی سے اُٹھ بیٹھی اور اس سائرہ کو اپنے سینہ سے اس طرح لگا لیا جیسے یہ سائرہ، اس کی ماں جائی بہن ہے ——— اور یہ سائرہ، نہ جانے کیسے اس کے سینہ سے لپٹ کر اس طرح رونے لگی جیسے وہ ننھی سی بچی ہے۔ اور اپنی کسی غلطی پر نادم ہو کر اپنی امی کے سینہ سے لپٹی رو رہی ہے۔ زبیدہ نے اس کو بہت زور کے ساتھ اپنے سینہ سے بھینچ لیا اور اس کی پیشانی چومتی ہوئی بولی۔

"تم تو بالکل بچوں کی طرح رونے لگی ہو، تم تو ہنسنے کے لئے پیدا ہوئی ہو۔ تمہیں رونے سے کیا غرض، اور سائرہ جیسے کچھ سمجھ گئی ہو، جیسے اس نے زبیدہ کے ان الفاظ کی

تہہ میں بیٹھی ہوئی رُوح کو پالیا ہو۔ اس کے آنسو آپ ہی آپ رُک گئے۔ اور اس نے زبیدہ کے سینہ سے الگ ہوتے ہوئے، اس کے دامن سے کھیلتے ہوئے جواب دیا۔

" آپاجی! رات مجھ سے بڑی غلطی ہوئی، میں نے آپ کو یوں ہی، ان کی.... ایک غلطی سے آگاہ کردیا۔ اب سوچتی ہوں۔ تو جی چاہتا ہے۔ اپنا گلا گھونٹ لوں "

اور آپا بی زبیدہ کو اچانک رات کی وہ بات یاد آگئی، جسے اس کے دل کے غم نے انتہا سے تجاوز کرنے کے بعد بالکل بھلا دیا تھا۔ اور اس بات کے بھیانک پن کے خیال سے وہ گھبرا سی گئی اور سائرہ کی ندامت سے اُلجھنے کی بجائے اپنے لہجہ میں انتہائی سنجیدگی پیدا کرتے ہوئے کہنے لگی:۔

" اور میں تو اتنی بڑی بات بھول گئی تھی، سائرہ پیاری ذرا کسی کو بھیج کر اس مریم کو تو بلاؤ۔"

سائرہ کانپ اُٹھی، اسے خیال ہوا، آپا زبیدہ کہیں اس مریم کو ڈانٹنے نہ لگیں اور پھر بات بڑھ نہ جائے اور اسے اپنے ساجن کے سامنے شرمندہ نہ ہونا پڑے۔ رات وہ کتنی شرمندہ تھی، شرم سے کٹی جارہی تھی، جب کہ سرفراز اس کے پاؤں پر سر رکھ کر اس سے روتی روتی آواز میں کہہ رہا تھا:۔

" سائرہ میری جان! قسم لے لو، جو تمہیں اپنا لینے کے بعد میں نے کسی اور عورت کے بارہ میں سوچا بھی ہو۔ میری مسرت! تمہیں پالینے کے بعد میں ہر عورت کو بھول گیا ہوں۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے، جیسے میرے جواں اور دھڑکتے دل پر کسی نے اچانک سکون کے تہہ بہ تہہ غلاف چڑھا دیئے ہیں! ۔ اور میری رُوح اب ایک ایسا راگ گانے لگی ہے جس کی مٹھاس کو میں مرتے وقت تک بھول نہیں سکتا۔

اور روٹھی سائرہ نے اپنے اس ساجن کا سر اپنے نازک پاؤں سے اُٹھا کر اپنے دِل کے قریب رکھ لیا۔ اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ وہ بھی کتنی سادہ تھی، کتنی بھولی اور کتنی معصُوم کہ ابھی وہ اپنے دِل کی دھڑکنوں اور احساسات اور جذبات کے اُمنڈتے ہوئے طوفانوں کو الفاظ کی صُورت نہ دے سکتی تھی اور سرفراز ایسی معصُوم لڑکیوں کو بہلانے اور پھسلانے کے گروں سے خوب واقف تھا۔ اور وہ سائرہ کی ان سسکیوں کے اندر چھپی ہوئی توت کو سمجھ گیا تھا۔ اس نے اس سائرہ کو اپنے مضبوط اور جوان سینہ کے ساتھ اس زور سے بھینچا کہ سائرہ کو اپنی سانس رُکتی ہُوئی محسوس ہوئی اور آنسو تو جیسے بالکل دب کر رہ گئے۔

اور پھر جب وہ صبح بیدار ہوئی۔ تو اتنی خوش تھی جیسے اس کے دل پر چھائے شبہات کے بادل دفعتاً چھٹ گئے ہوں۔ اور اس عالم میں اسے اپنے پہلو میں سویا ہوا جوان سرفراز اتنا رعنا اور اتنا پیارا معلوم ہوا کہ اس نے آج شرم کی وہ اوڑھنی قطعاً اتار پھینکی جو ایک نئی نویلی اور شریف دلہن کے چہرہ پر شادی کی رات کے وقت سے متواتر کئی دن تک پڑی رہتی ہے۔ وہ اپنے اس سوتے ساجن سے بے تحاشہ لپٹ گئی، اور اس کی جوان پیشانی، چہرہ اور شوخ آنکھوں کو ہزار بار چوم چوم لیا۔

اور سرفراز کے دل کی دُنیا تابناک سے تابناک ہوتی چلی گئی وہ سائرہ کے لپٹتے ہی جاگ اُٹھا تھا مگر سوتا بن گیا۔ وہ آج ایک عجیب کیف سے واقف ہوا۔ اس کی زندگی میں یہ بالکل نئی کیفیت تھی جو اس پر طاری ہوئی تھی۔ اس سے پہلے وہ سینکڑوں جوان عورتوں کے جسموں سے کھیلا بھی تھا۔ ان کے حسین چہروں کو چوما اور ہونٹوں پر ہونٹ رکھے بھی تھے۔ مگر آج سے پہلے کسی عورت کے اندر یہ والہانہ جذبات نہ پیدا ہوئے تھے۔ جو اس وقت اس سائرہ کے رگ و پے کو ایک مسلسل دھڑکن اور ایک ہمہ اضطراب بناتے تھے۔

اور یہی سبب تھا کہ جب سائرہ زبیدہ کے پلنگ پر آن بیٹھی تو شرمائے شرمائے تھی۔ اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے آپا زبیدہ نے اس کی وارفتگیوں اور حماقتوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا ہے، مگر یہ شرم اور ندامت آپا زبیدہ کے پاس بیٹھے بیٹھے ایک عجیب قسم کے جذبہ میں بدل گئی تھی۔ اور سائرہ کو خیال ہونے لگا تھا کہ اس نے رات اپنے ساجن کی ایک غلطی کو فاش کر کے ایک بڑے جرم کا ارتکاب کیا ہے۔ نہ جانے کس بڑی قوت نے اس کے دل کے کان میں کہہ دیا تھا۔ کہ وہ تو اپنے ساجن کی ہر عریانی اور ہر ننگ کا لباس ہے۔ وہ تو پردہ ہے کثیف اور دبیز پردہ! اور یہ پردہ کبھی اُٹھنا نہیں چاہئے تھا۔ مگر رات وہ اس پردہ کو اُٹھا چکی تھی اور عورت پن کی ایک بڑی عظمت سے محروم ہو گئی تھی۔ اور وہ چاہتی تھی، کہ آپا زبیدہ کی آنکھیں جلد کھل جائیں اور وہ اس سے اپنی اس کوتاہی کی اصلاح میں مدد لے۔ مگر جیسے ہی آپا زبیدہ نے مریم کو بلانے کا حکم دیا۔ اس کا نازک جسم ایک نئے خوف سے کانپنے لگا۔ اور اس نے آپا زبیدہ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے قریب قریب ڈوبتی آواز میں کہا

" نہ آپا مریم کو نہ بلاؤ۔ وہ بہت بے شرم ہو گئی ہے، جو منہ میں آتا ہے بک دیتی ہے۔ کہیں بات طول نہ پکڑ جائے۔"

اور آپا زبیدہ اس کے دل کی ہر گہرائی اور اس کے عورت پن کی ہر عظمت سے آگاہ ہو گئی اور اس نے اس کی پیشانی چومتے ہوئے جواب دیا۔

" نہیں میری رانی! میں مریم کو ایک اور بات کے لئے بلا رہی ہوں۔ ایک بڑی ضروری بات کے لئے۔ ایسی بات کے لئے جس سے سرفراز اور اس کا جرم ڈھک جائے گا۔ اس پر کبھی نہ اُٹھنے والے دبیز اور وزنی پردے پڑ جائیں گے۔"

اور سائرہ کو یہ سُن کر آج پہلی دفعہ یہ احساس ہوا کہ بہن اپنے بھائی کے لئے جو

محبت رکھتی ہے۔ اس کی عظمت کی نہ کوئی حد ہے اور نہ انتہا۔

اور سچ مچ زبیدہ اپنے اس بھائی کی محبت میں ایک ایسا انوکھا کام کرنے والی تھی، جو شاید کسی بہن نے آج تک اپنے کسی بھائی کے لئے نہ کیا ہو۔

مریم آگئی۔ اس کی آنکھیں سُوجی ہوئی تھیں اور پاؤں بوجھل بوجھل سے تھے۔ وہ بہت شرمائی شرمائی لجائی لجائی، کمرہ میں داخل ہوئی۔ اور جیسے ہی وہ داخل ہوئی، زبیدہ اپنی جگہ سے دیوانہ وار اُٹھی اور اس مریم کو اپنے بازوؤں میں لے لیا —— اور یہ مریم بھی عورت تھی، ٹھکرائی ہوئی، مظلوم، بے چاری۔ اور دہکتے ہوئے لاتعداد دوزخوں کے دہانے پر کھڑی ہوئی عورت۔ وہ زبیدہ کے بازوؤں میں لپٹی سسکیاں بھر بھر کر رونے لگی۔ اور جب خوب رو چکی تو زبیدہ نے اس کے آنسو پونچھتے ہوئے بہت دھیمی آواز میں سرگوشی کی۔

"مریم! معاف کرنا، مجھے یہ بات معلوم ہوگئی ہے۔"

مریم نے روتے روتے بات کاٹ لی۔ "آپا یہ میں جانتی ہوں، اور میں کتنی بے شرم ہوں کہ مر نہیں گئی۔"

آپا زبیدہ نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور پہلے ہی سے انداز میں کہنے لگی

"نہیں مریم! اس میں مرنے کی کوئی بات نہ تھی، تم بھی آدمی ہو اور آدمی سے ہمیشہ لغزشیں ہوئیں! اور میں نے تمہاری اس لغزش کی تہہ بھی پالی اور میں نے اس کی تلافی کا پروگرام بھی بنالیا ہے۔ آج ہی تمہیں میرے ساتھ، شہر چلنا ہوگا۔ میری خالہ وہاں رہتی ہیں ہم اور تم دونوں ان کے پاس رہیں گی اور جب تک تمہیں اس بوجھ سے چھٹکارہ نہ ملے گا۔ اس وقت تک میں واپس نہیں آؤں گی۔"

مریم نے بات کاٹ لی "مگر آپا پھر بھی ایسی باتیں چھپا نہیں کرتیں۔"

زبیدہ ہنستی ہوئی بولی " مگر میں اسے چھپا لوں گی مریم، تم اس کی فکر نہ کرو"۔

اور مریم کے چہرے پر چھائی زردی کی بہت سی تہیں اچانک غائب ہوگئیں، اور جب اسی شام، بوا رحیمن اور ذیلدارنی کی اجازت کے بعد، زبیدہ مریم اور بوا کرمیں کو ساتھ لے کر شہر جانے کے لئے موٹر میں سوار ہوئیں — تو سائرہ اور سرفراز آپا زبیدہ کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر بچوں کی طرح رونے لگے۔

مگر زبیدہ مسکرا رہی تھی۔ ایسے جیسے وہ اس دنیا کی ہر عورت سے بڑی، اور ہر انسان سے انوکھی ہے۔

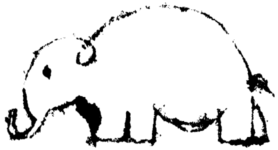

سولھواں باب

شاہ جی بابا نے، اس بڑھاپے میں ایک بڑا غم کھایا تھا، ایسا غم جس کی نہ کوئی انتہا تھی اور نہ حد۔ وہ خود حیران تھے کہ اتنے بڑے حادثہ کے بعد وہ زندہ کیسے رہ گئے۔ ان کی حرکت قلب بند کیوں نہیں ہو گئی؟ مگر وہ کیسے مر سکتے تھے، انہیں تو جینا تھا، اور جی کر، اس انوکھے صدمے کو سہنا تھا۔ اس لئے کہ ان کی زندگی اپنی نہ تھی، یہ تو اندھی اور بے بس صابرہ اور معصوم اور کمسن زہرہ کے لئے تھی۔ وہ تو ان دو بچوں کے لئے جی رہے تھے جن کا اس وسیع عالم میں کوئی اور نہ تھا۔ یقیناً ان کی بہن تھی، اور یہ بہن ان سے محبت بھی کرتی، ان کے لئے روتی اور تڑپتی بھی، وہ انہیں اپنے پاس بھی لانا چاہتی تھی، سرفراز نے خود اس سے، اس بات کی فرمائش کی تھی مگر جب اس نے اپنے دل کی یہ بات شاہ جی بابا سے کہی تو شاہ جی بابا کے صبر کی طنابیں ٹوٹ گئیں۔ اور وہ بچوں کی سی بے بسی کے ساتھ رونے لگے اور سائرہ سہم گئی۔ وہ شاہ جی بابا سے محبت ہی نہیں عقیدت رکھتی تھی۔ اس کے بس میں ہوتا تو شاہ جی بابا کے بوڑھے قدموں میں اپنی ساری جوانی کاٹ دیتی، اور بیٹی کی قربانیوں کی تاریخ میں جہاں آرا بیگم بنت شاہجہان کے ساتھ ساتھ اس کا نام بھی زریں حروف سے لکھا جاتا۔ مگر شاہ جی بابا ایسی کوئی قربانی نہ چاہتے تھے، وہ تو سائرہ سے

بس اس بات کے آرزومند تھے کہ وہ صابرہ اور زہرہ کی خدمت کا بوجھ ان کے کندھوں پر سے نہ اُٹھائے اور انہیں یہ "بوجھ" کتنا عزیز تھا، سائرہ کیا جانتی۔ وہ غریب نوشاہ جی بابا کے دل کی گہرائیوں میں بسنے والی اس غیر فانی محبت سے آگاہ نہ تھی، جو انہیں اس کی مری ہوئی ماں سے تھی۔

شاہ جی بابا کی شخصیت کی طرح ان کی یہ محبت بھی انوکھی تھی، وہ طوفانی رات جس کا تصور انہوں نے اور بوڑھے ذیلدار نے سرفراز پر حملہ کی رات یکساں اپنے دل اور دماغ پر مسلّط پایا تھا، شاہ جی بابا کو کبھی نہیں بھولی تھی۔ اس رات کو گزرے ہوئے پورے چھپّن سال ہوچکے تھے۔ اور اس وقت شاہ جی بابا، شاہ جی بابا نہ تھے "سلطان بچّو" کے نام سے پکارے جاتے، اور یہ نام انہیں سائرہ کے نانا محمد شاہ جی نے عطا کیا تھا "سلطان بچّو" کی عمر اس وقت پندرہ سال کی تھی۔ مگر وہ اپنے بچے منور کی طرح اپنی اس عمر میں خود کو جوان پاتے تھے، قوی اور توانا جوان۔

اس رات سے چند دن بعد جب "فاطمہ" نوشاہ سے بیاہ دی گئی اور وہ اسے ساتھ لے کر اپنے گاؤں فیروز آباد چلا گیا۔ تو "سلطان بچّو" نے بستی میں آنا چھوڑ دیا۔ اس نے باغ ہی میں جھونپڑی بنالی، اور اس بستی سے مُنہ موڑ لیا، جو اس کی محبوبہ سے خالی ہوگئی تھی۔

یہ کتنا بڑا ظلم تھا جو "سلطان بچّو" پر کیا گیا تھا، مگر "سلطان بچّو" نے آہیں نہ بھریں شکوے نہ کئے اور صبر کی سِل اپنے ارماں بھرے دل پر رکھ لی، یہ انوکھا احتجاج تھا، اس لڈلے "سلطان بچّو" کا — اس کی ماں اور باپ دونوں، دن میں کئی کئی بار اس کے پاس آتے، وہ ان کا اکلوتا بچّہ تھا۔ اور وہ کسی طرح بھی اسے اس حال میں اکیلا چھوڑنا

نہ چاہتے تھے۔ مگر" سلطان بچو" بڑا ضدی تھا، اس نے ان کی کوئی بات نہ سُنی، اور ان کے ساتھ گھر نہیں گیا، ماں وہیں دھرنا مار کر بیٹھ گئی، تو سلطان بچو نے اسے دھمکی دی میں اپنا گلا گھونٹ لوں گا نہیں تو یہاں سے گھر چلی جاؤ۔ اور غریب ماں ہار گئی، اور گھر واپس آگئی۔

کئی دن بعد، ضمیر احمد ہسپتال سے اچھا ہو کر لوٹا، تو یہ حال معلوم کر کے، سیدھا اس کے پاس آیا۔ حالانکہ اس ضدی نے اس کے پیٹ میں چاقو گھونپا تھا۔ مگر پھر بھی اسے اس سے محبت تھی۔ وہ آتے ہی اس کے سینے سے لپٹ گیا۔ اور دونوں آنسو بہانے لگے۔

فاطمہ اور نور شاہ کو" سلطان بچو" کی اس اسٹرائک کے بارہ میں کچھ معلوم نہیں تھا وہ دونوں تو اس بستی سے پچاس میل دور فیروز آباد میں بیٹھے جوانی اور محبت کی راگنیاں چھیڑے تھے۔

اور جب پندرھویں دن، وہ دونوں اسی بستی میں محمد شاہ جی سے ملنے آئے، تو شاہ جی، باغ میں تھے۔ وہ سلطان بچو کو منانے گئے تھے اور سلطان بچو ان سے رو رو کر کہہ رہا تھا۔

" آخر آپ کی اس دنیا میں یہ اتنا جبر کیوں کیا جاتا ہے۔ میں بستی جانا نہیں چاہتا۔ اب میرا اس بستی میں کیا رہ گیا ہے؟ — شاہ جی مجھے بھول جائیے۔

اور شاہ جی بُری طرح رونے لگے۔ انہیں" سلطان بچو" کی محبت اور اس کی گہرائیوں کا علم نہ تھا۔ اگر وہ جانتے تو فاطمہ کو نور شاہ سے کبھی نہ بیاہتے۔ مگر اب تو سب کچھ ہو چکا تھا محمد شاہ جی کا دل ڈوب گیا اور وہ چُپ چاپ گھر آگئے۔

اور یہاں گھر میں فاطمہ اپنی بچی کو بیٹھے دیکھا، تو بے اختیار اس کو گلے لگا لیا اور

آپ ہی آپ رونے لگے ۔ فاطمہ حیران رہ گئی ۔ باپ کے رونے کی وجہ پوچھی، اور جب انہوں نے رونے کا سبب اس سے کہا تو فاطمہ کو ایسے معلوم ہوا جیسے ، اس کے بادا نے، اس کے دل کے شیشہ پر بہت وزنی پتھر پھینک مارا ہے ۔

نورشاہ ، ضمیر احمد کے ہاں گیا تھا ، اگر وہ اس وقت یہاں ہوتا ، تو اسے فاطمہ کے چہرہ سے آج ایک عجیب بات معلوم ہوتی ، اور یہ عجیب بات فاطمہ کے چہرہ پر ہی نہیں اس کے دل پر بھی نقش ہو گئی تھی ــــــ فاطمہ نے بادا سے کوئی بات نہیں کہی ۔ چپ چاپ اندر جا بیٹھی ۔ اور جب نورشاہ کتنی دیر کے بعد گھر آیا ، تو فاطمہ روتے روتے سو گئی تھی ۔

نورشاہ اور ، فاطمہ کے باپ میں اس موضوع پر کوئی بات نہیں ہوئی ۔ البتہ نورشاہ اس فاطمہ سے آج بہت کچھ کہنا چاہتا تھا ۔ ضمیر احمد نے اس سے " سلطان بچو " کی اس عجیب غریب ہڑتال کی ساری وجہیں کہہ دی تھیں ۔ اور نورشاہ کے دل کی کچھ عجیب حالت ہو گئی تھی ۔ مگر بڑے شاہ جی کی موجودگی میں وہ فاطمہ کو جگانے کی جرأت نہ کر سکا ۔

ان سب کے بستر ایک ہی کمرہ میں بچھے تھے اور نورشاہ اپنی ساری معلومات کو سینہ کے خزانہ میں بند کر کے اپنی چارپائی پر آن لیٹا ۔ اور بڑی رات تک یہ عجیب غریب بات سوچتا رہا ۔

وہ عجیب اضطراب میں پھنسا تھا ۔ اسے وہم ہونے لگا تھا ، کہیں یہ فاطمہ بھی اس سلطان احمد سے پیار تو نہیں کرتی ؟ نورشاہ کی عمر گو اس وقت سترہ سال کی تھی ، مگر اس کا دماغ ابھی دودھ پیتا بچہ تھا ، ضدی ، تنکی ، اور بات بات پر روٹھ جانے والا ۔ وہ آپ ہی آپ ، خیال ہی خیال میں اس فاطمہ سے روٹھ گیا ۔ اور دوسری صبح ، جب بڑے شاہ جی نے اسے اور فاطمہ کو صبح کی نماز کے لئے اٹھایا تو نورشاہ کا جی چاہا مسجد کے

بڑے کنڈیں میں کود جائے!

اس دن اس نے فاطمہ کے ساتھ کوئی خاص بات نہیں کی، سارا دن ضمیر احمد کے پاس رہا۔ اور جب ضمیر احمد، سلطان احمد کے پاس چلا گیا اور بڑی دیر تک واپس نہ آیا تو نورشاہ کا جی چاہا، وہ بھی اس "مسخرہ" کے پاس جائے اور اس کے منہ پر تھوک دے۔ اور جب وہ اس کے پاس پہنچا ـــ تو سلطان بچوں بری طرح رو رہا تھا اور ضمیر احمد نے اس کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لئے تھے۔

نورشاہ، کچھ کہے بغیر لوٹ آیا۔ اور فاطمہ کو ساتھ لے کر اپنے گاؤں چلا گیا۔ مگر ان دونوں کے دلوں میں ایک اچھی خاصی خلیج حائل ہو گئی تھی۔ دونوں کی زندگی کی وہ مسرتیں ان سے روٹھ گئی تھیں۔ جنہوں نے شادی کے پہلے دو ہفتوں میں، طوفان کی صورت اختیار کر لی تھی

فاطمہ بیوی تھی، اور نیک اور فرض شناس تھی، اس نے نورشاہ، کا ہر طعنہ اور ہر سختی برداشت کی، مگر زبان پر آہ نہ لائی۔ اسے سلطان احمد سے محبت نہیں تھی، محبت اسے اس نورشاہ سے بھی شادی سے پہلے نہ تھی۔ وہ دونوں اس کے نزدیک شادی سے پہلے ایک جیسے تھے۔ اگر اسے معلوم ہو جاتا، کہ سلطان احمد کی محبت اس دیوانگی کی حد تک بڑھ چکی ہے، تو وہ کبھی نورشاہ سے شادی نہ کرتی۔ مگر اب تو اس کی شادی ہو چکی تھی۔ اور وہ کسی عنوان شوہر کے خلاف نہ جا سکتی تھی۔ نہ ذہنی طور پر اور نہ عملی طور پر، البتہ اسے سلطان احمد سے ہمدردی پیدا ہو گئی تھی ـــ اور یہ ہمدردی، نورشاہ کے طعنوں سے برابر بڑھتی جا رہی تھی۔

مہینے پر مہینے، اور سال پر سال بیتنے لگے۔ فاطمہ کے ہاں تین بچے پیدا ہوئے اور یکے بعد دیگرے اس دنیا سے رخصت ہوئے۔ اور اس کی صحت گرنے لگی۔ بڑے شاہ جی اسے گھر لے آئے، اور نورشاہ جی اس سے خفا ہو کر، لاہور چلے گئے۔

ضمیر احمد کی شادی ہو گئی ، مگر سلطان بچو ، اس بستی میں نہیں گھسا ، اس کی ماں اور باپ بھی وہیں باغ میں آن بسے ۔ ضمیر احمد ، صبح ، شام ، اس سلطان احمد کے پاس جاتا گو وہ مالدار باپ کا بیٹا تھا ، مگر سلطان احمد کی دوستی اس کی روح کی غذا بن گئی تھی ۔ اور روح کی اس غذا کو اس نے کبھی نظر انداز نہ کیا ۔ اس کی بیوی رحمت کو پہلے پہل تو اس سلطان احمد سے حسد ہونے لگا جس کے پاس اس کا شوہر اس پابندی سے جاتا ۔ مگر پھر آپ ہی آپ راہ پر آگئی ، اور حسد کی جگہ ہمدردی اور پھر عقیدت نے لے لی ۔

مگر سلطان احمد کی زندگی کی روش نہ بدلی ۔ وہ سارا سارا دن ، باغ میں رہتا ، اس میں نئے نئے پودے لگاتا ، کھیتوں کی دیکھ بھال کرتا ۔ اور جب اس کی بوڑھی ماں اس سے آنکھوں میں آنسو بھر کر کہتی ۔

" بیٹے ! شادی کر لو "

تو وہ ہنس کر چپ ہو جاتا ۔ اور یہ اصرار کرنے والی ماں ، موت کے دامن میں جا سوئی ، اور چند سال بعد بوڑھا باپ بھی چل بسا ۔ اب سلطان احمد تنہا ، اس باغ میں رہتا ، کبھی کبھی رات کے وقت ضمیر احمد بھی اس کے پاس آسوتا ۔ اور یہ رات دونوں کے لئے کچھ عجیب ہوتی ، ضمیر احمد رحمت کی باتیں کرتا ۔ سلطان سے " عورت " کی دلچسپیوں کی داستان کہتا ۔ مگر سلطان احمد آہ سرد بھر کر ، منہ دوسری طرف پھیر لیتا اور جب ضمیر احمد زبردستی اس کا منہ اپنی طرف کر لیتا ، تو سلطان احمد کے گالوں پر آنسو لڑھکتے ہوتے ۔

سلطان احمد کی زندگی کا چھکڑا ، یوں ہی کھسڑ کھسڑ کرتا چلتا رہا ۔ نور شاہ ، فاطمہ سے روٹھا رہا ، مگر قربان جائیں اس فاطمہ کے اس نے کسی سے اپنے شوہر کی اس بے ہودگی کا رونا نہیں رویا ۔

بڑے شاہ جی اس دُنیا سے رخصت ہو گئے۔ بستی میں ایک طوفان اُٹھا، اور یہ طوفان متواتر پندرہ سال کی ہجرت کے بعد، سلطان احمد کو بستی میں لے آیا۔ یہ رات بڑی خوفناک تھی۔ اندر فاطمہ رو رہی تھی اور باہر سلطان احمد چیخ رہا تھا۔

ضمیر احمد نے اسے اور اس کی بیوی رحمت نے فاطمہ کو سنبھالا، فاطمہ تو سنبھل گئی، مگر سلطان احمد کے حواس پر تو بجلی گر پڑی تھی۔ اور ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے یہ پاگل ہو گیا ہے!

مگر وہ پاگل نہیں ہوا تھا۔ اس کا عشق ایک ایسے مقام پر پہنچ گیا تھا۔ جہاں صبر وضبط کی طنابیں کھینچ کر ٹوٹ جاتی ہیں۔ اس نے کئی بار ضمیر احمد کی گرفت سے اپنے آپ کو چھڑا لیا۔ اور اندر کی طرف بھاگا، مگر ضمیر احمد نے اسے پھر پکڑ لیا، اور اگر وہ اسے نہ پکڑ لیتا تو سلطان احمد عالمِ دیوانگی میں فاطمہ کے گلے سے جا لپٹتا، اور اس کا گلا بھی گھونٹ دیتا۔ اور آپ بھی مر جاتا مگر نہ جانے کیسے یہ ساری دیوانگیاں، اس وقت آپ ہی آپ رُک گئیں، جب تیسرے دن، نور شاہ یہاں آن پہنچا۔ اس نے سلطان احمد کو اور سلطان احمد نے اسے دیکھا۔ سلطان احمد کی اس وقت جو حالت تھی، اس سے نور شاہ کے شبہات اور بڑھ گئے۔ اور اس کا جی چاہا اس دیوانے کا گلا گھونٹ دے۔ مگر سلطان احمد کی آنکھیں آپ ہی آپ بہنے لگیں اور نور شاہ کے دل پر چھائے بادل کسی قدر چھٹ گئے۔

پہلے ضمیر احمد نے اور پھر سلطان احمد نے اسے گلے لگایا۔ اور اسے اندر بھیجا۔ اور خود دونوں وہاں سے باغ چلے آئے، اب ان دونوں کی وہاں ضرورت نہ تھی۔ سلطان احمد کو پھر چپ لگ گئی۔ اب وہ نہ چیختا اور نہ چلاتا، صرف سوچتا، صرف روتا۔

نور شاہ یہیں بس گیا اور فاطمہ اور اس میں بننے لگی، اور ان دونوں کی زندگی کی کشتی بھنور سے نکل کر بڑی ہمواری کے ساتھ آگے کی طرف بڑھنے لگی۔

مگر سلطان احمد کی زندگی دن بہ دن بوجھل ہوتی گئی، وہ گو اب بستی میں آتا۔ دن
دن بھر منیر احمد کے ہاں جو اب باپ کی جگہ ذیلدار تھا پڑا رہتا۔

بی رحمت اس سے دلچسپی لینے لگی تھی۔ ذیلدار کی جگہ اب وہ اس سے کہتی، شادی کرلو
اپنا نام پیچھے چھوڑ جاؤ،

مگر وہ ہنس دیتا، اور رحمت بگڑ جاتی مگر پھر آپ ہی آپ من جاتی۔ اور اس کے سامنے
کئی عورتوں کے نام لے لے کر ان کی تعریفیں کرنے لگتی۔

اور ذیلدار یہ تعریفیں سن کر شوخی میں آجاتا اور کہتا۔ "یہ بے وقوف تو دنیا میں اس لئے
پیدا نہیں ہوا، رحمت تم ان ساری عورتوں کو ہم سے بیاہ دو"

اور رحمت اس کے دل میں چٹکی لیتی "جی ہاں، بڑی مردانگی ہے نا آپ میں۔ پچیس
سال ہو گئے شادی کر ہوئے اور ابھی تک بچے کی صورت نہیں دیکھی"

اور میاں ذیلدار سر جھکا لیتے، اور رحمت منہ پھلا کر اندر چلی جاتی۔

ذیلدار قصوروار نہ تھا۔ یہ تو کوئی حکمت الہٰی تھی کہ ان کے ہاں اب تک کوئی بچہ نہیں
ہوا تھا۔ ورنہ ذیلدار تو مردانہ اوصاف میں اپنی مثال آپ تھا۔

پانچ سال بعد جب، ذیلدار پچاس سال کا ہو گیا۔ رحمت کی کوکھ بھاری ہوئی، اور
نو مہینے بعد سرفراز پیدا ہوا، اور جب رحمت زچگی سے فارغ ہو گئی، اور سلطان احمد اسے مبارکباد
دینے کے لئے اس کے پاس آیا تو بچہ کو گود میں اچھالتے ہوئے اس سے کہنے لگی:۔

"شاہ جی، کیا تمہارا جی نہیں چاہتا کہ تمہارے ہاں بھی کوئی ایسا ہی چاند سا بیٹا پیدا ہو؟"

سلطان احمد نے اس بچہ کو گود میں لے لیا، اور نہ جانے کیسے، اس کے دل میں آج
ایک عجیب خواہش آپ ہی آپ جاگ اٹھی، باپ بننے کی خواہش مگر اس نے فوراً اپنی اس خواہش پر

قالو پالیا - اور وہاں سے بھاگ گیا۔ اور پھر بستی میں نہیں آیا ـ ضمیر احمد اور رحمت نے ہزار سر پیٹا، ہزار خوشامد کی، مگر وہ تو ضدی تھا، خوفناک قسم کا ضدی، اب ضمیر احمد کی اکثر راتیں اور دنوں کا اکثر حصہ پھر باغ میں کٹنے لگا۔

کبھی کبھی نور شاہ بھی ان کے پاس آجاتا۔ اس کی مالی حالت اچھی نہ تھی۔ بڑے شاہ جی کی ساری پونجی ختم ہوگئی تھی۔ اور نور شاہ کی بیوی فاطمہ کو باپ کی طرف سے جو زمین ملی تھی وہ صرف پانچ بیگھے تھی اور یہ زمین کتنی ناکافی تھی، جب وہ یہ دکھڑا سلطان احمد سے کہتا، تو سلطان احمد سر جھکا لیتا اور سوچنے لگتا۔ اس کی خدمت میں اپنی زمین کی پیداوار کی نذر پیش کرے، کیا وہ بگڑ تو نہ جائے گا۔ مگر نور شاہ ان لوگوں میں نہ تھا، اور جب سلطان احمد نے اس کی خدمت میں یہ نذر پیش کی، تو نور شاہ کی آنکھیں ایک عجیب خوشی سے چمک اٹھیں

دوسرے دن، سلطان احمد کے ہاں کے غلّے کا سارا ذخیرہ، نور شاہ کے ہاں آن پہنچا

ان دنوں، آموں کا موسم تھا اور سلطان احمد نے قلمی آموں کے کئی ٹوکرے غلام محمد چوکیدار کے سر پر لاد دیئے کہ نور شاہ کے ہاں پہنچا دے۔

اور یہ ہر روز ہونے لگا، ـــ اور فاطمہ کے دل کا اضطراب لمحہ بہ لمحہ پھر بڑھنے لگا باپ کی موت کے بعد جو سکون، اس کی زندگی میں نور شاہ سے صلح ہو جانے کے بعد پیدا ہوگیا تھا، پھر اس سے چھنتا گیا۔

مگر ـــ ساندرہ آن پہنچی - اور اس کی ممتا اس اضطراب پر غالب ہونے کی کوشش کرنے لگی - اور شاید وہ اپنی اس کوشش میں ناکام ہی رہ جاتی، اگر اچانک رحمت بی بی اس کے پاس بھاگی بھاگی نہ آتی اور صحن میں کھڑے ہو کر نہ چیخ اٹھتی۔

" اری فاطمہ بی بی، کچھ اور بھی سُنا، ساری کائنات نے اپنی روش بدل لی ہے ـ

اب ستارے دن کو دکھا کریں گے۔ اور سورج رات کو نکلا کرے گا۔

فاطمہ نے حیرت سے پوچھا :۔

" یہ آپ کیا پہیلیاں ارشاد فرما رہی ہیں۔ میری سمجھ میں تو خاک نہیں آیا۔"

رحمت بی بی برآمدہ میں آن پہنچی۔ اور اس کے کان میں کہنے لگی :۔

" سلطان احمد شاہ جی نے رات ایک مسافر عورت سے نکاح کر لیا ہے۔"

فاطمہ کا منہ حیرت سے کھلا کا کھلا رہ گیا۔ نہ جانے کیوں اس کے دل میں ایک عجیب خواہش جاگی، اے کاش سلطان احمد ایسا نہ کرتے۔ اور اگر ایسا نہ کرتے۔ تو میرے دل سے یہ عجیب و غریب سرخوشی نہ چھنتی، مگر اب تو انہوں نے ایسا کر لیا تھا، اور فاطمہ سے یہ عجیب و غریب پندار چھن گیا تھا۔ اس لئے، اس کو کھوج ہوئی، شاہ جی نے یہ کس عورت سے شادی کی ہے، یہ کون عورت ہے جس نے اس بڑھاپے میں شاہ جی کے دل سے اس کی محبت چھین لی ہے اور جب اسے اسی شام اس عورت سے ملنے کا اتفاق ہوا تو اسے شاہ جی کی عقل پر بڑا افسوس ہوا، یہ عورت نہ تو خوبصورت تھی اور نہ جوان، اور چہرہ تو زندگی کی ہر رونق سے محروم تھا اور فاطمہ نے سوچا، اس بے وقوف سلطان احمد نے اس کی جگہ بھی دی تو کس کو، ایسی عورت کو جو ایک بھنگی کے قابل بھی نہ تھی، مگر فاطمہ نہیں جانتی تھی کہ شاہ جی کو اس عورت کی کیا بات پسند آئی تھی وہ تو بالکل انوکھے تھے۔ یہ بے چاری عورت نہ جانے کیسے ان کے باغ میں آن گھسی اور کنوئیں پر کھڑے ہو کر ادھر ادھر دیکھنے لگی، کتنی پیاس تھی اس کی آنکھوں میں اور کتنی تھکن تھی اس کے جسم پر جب شاہ جی نے اسے دیکھا۔ انہوں نے اسے پانی پلایا۔ اسے کھانا دیا۔ پھل دیئے۔ اور جب وہ عورت انہیں کھا رہی تھی، تو سہمی سہمی مگر احسان مند نگاہوں سے شاہ جی کو دیکھنے لگی اور شاہ جی کا سارا جسم اس کی بے بسی، بے چارگی اور افلاس کے

تصوّر پر کانپنے لگتا۔ اور ان کے جسم کا یہ لرزا ان کے لئے ایک عجیب اضطراب بن گیا۔ انہیں اس عورت کی بے لبسی اور بے چارگی سے ایک قسم کی ہمدردی ہو گئی، اور جب ان کے کئی سوالوں کے جواب میں یہ عورت اپنی بے چارگیوں کی داستان ان سے کہنے لگی تو وہ برداشت نہ کر سکے، اسے روک دیا! اور یک بیک چیخے!

"اے عورت تو مجھ سے نکاح کرے گی؟"

اور اس عورت کے چہرہ پر چھائی زردی حیرت و استعجاب کی سُرخی میں بدل گئی۔

اس رات ضمیر احمد نے غلام محمد چوکیدار اور قہر بخش کی موجودگی میں ان دونوں کا نکاح کر دیا ۔ اور شاہ جی مجرد سے متاہل ہو گئے۔ اور فاطمہ شبہ میں پڑ گئی کہ شاہ جی کا دماغ شاید چل نکلا ہے۔ فاطمہ گو بظاہر خوش تھی، مگر نہ جانے، شاہ جی کی اس شادی نے اس کے دل پر کیا بوجھ رکھ دیا تھا، کہ دل اندر ہی اندر ڈوبتا رہتا اور وہ سوچتی رہتی، وہ ایک غیر فانی محبت سے محروم ہو گئی ہے۔

اسی عالم میں اس کے ہاں صابرہ پیدا ہوئی۔ فاطمہ کے اندرونی اضطراب نے اس کی اس بچی کی بینائی چھین لی تھی اور اس کی پیدائش کے چند گھنٹے بعد ہی سب جان گئے تھے کہ صابرہ کی آنکھیں تو ہیں مگر ان میں بینائی نہیں ہے۔

اور ادھر، اس صابرہ کی پیدائش کے چند دن بعد منوّر اس دُنیا میں آیا —— اور فاطمہ زچگی کے عالم ہی میں پلنگ سے اُٹھ کر باہر بھاگ آئی، اور نور شاہ کے دونوں کندھوں کو جھنجھوڑتے ہوئے چیخی:-

"سلطان احمد کو میرے پاس بلا لاؤ۔

نور شاہ نے حیرت سے اسے دیکھا، اور نہ جانے اس کے دل میں پھر وہی شبہات

آن موجود ہوئے، جو جوانی کے دنوں میں اس کے دل کو گھیرے رہتے تھے۔ اس نے اپنے کندھے جھٹک دیئے اور کسی قدر غصّہ سے پوچھا:۔

"مگر آخر یہ کیا دیوانگی ہے، سلطان احمد اچانک کیوں یاد آ گئے تمہیں؟"

اور فاطمہ سنبھل گئی، اور جہاں کھڑی تھی وہیں بیٹھ گئی، نور شاہ نے اسے اٹھایا۔ پلنگ پر لایا، اور خیال آیا کہ اب تو ہم دونوں بڈھے ہو گئے ہیں۔ اب تو ہمیں اپنی زندگی تلخ نہ کرنی چاہیئے۔ اور اس خیال کے آتے ہی اس نے فاطمہ سے پوچھا:۔

"سلطان احمد کو کیوں بلانا چاہتی تھیں تم؟"

فاطمہ پہلے ہی سے شوق کے ساتھ بولی" میں سلطان احمد سے ایک وعدہ لینا چاہتی ہوں۔"

نور شاہ نے حیرت سے پوچھا" کیا وعدہ؟"

فاطمہ نے جواب دیا" کہ ان کا یہ بچّہ، میرا ہوا، وہ اس بچّہ کا بیاہ میری صابرہ سے کریں گے۔"

اور نور شاہ کے دل کا آسمان ہر ابر سے خالی ہو گیا، اسی شام سلطان احمد وہاں آئے بیٹھے تھے۔ اور فاطمہ پردہ کے پیچھے سے ان سے اپنی یہ خواہش کہہ رہی تھی۔ اور ان کا دل بلیّوں اچھلنے لگا تھا۔ اور یہ بلیوں اچھلتا دل، اس دن کے بعد سے تو ہمہ تن مسرّت بن گیا۔ گو اس موضوع پر پھر ان دونوں میں کوئی بات نہیں ہوئی، مگر وہ دونوں مطمئن تھے صابرہ اور منوّر دونوں پڑھنے لگے۔ منوّر کی بے کس ماں، شاید اس منوّر کو جننے یہاں آئی تھی کہ تیسرے سال اس دنیا سے رخصت ہوئی اور منوّر قریب قریب فاطمہ کے سپرد کر دیا گیا۔ اور فاطمہ اسے اس طرح پالنے لگی جیسے یہ اس کا اپنا بچّہ ہو۔ منوّر کی ماں کی موت سے اس

فاطمہ کو ایک عجیب قسم کی روحانی مسرت حاصل ہوئی تھی۔

اور اس کا وہ اضطراب اس سے چھین گیا تھا، جو صابرہ کو بینائی سے محروم کرنے کا سبب بنا، اور جب زہرہ پیدا ہوئی۔ تو اس میں فاطمہ کی ہر ذہانت، ہر سمجھ، اور ہر خوبی سمٹ آئی۔

فاطمہ بڑی خوش تھی، اتنی خوش کہ جب زہرہ کی پیدائش کے چند دن بعد نور شاہ اس دنیا سے رخصت ہو گیا تو فاطمہ کے دل کو کوئی خاص ملال نہیں ہوا۔

اور پھر بڑھاپا پاؤں پھیلاتا جا رہا تھا۔ سلطان احمد بھی بوڑھے ہو گئے تھے اور فاطمہ بی بی بھی۔ مگر ابھی تک دونوں ایک دوسرے سے پردہ کرتے تھے۔ دونوں میں ابھی تک وہی حجاب قائم تھا، جو جوانی میں ان دونوں کو ایک دوسرے سے دور دور رکھتا۔

بی فاطمہ کی موت نے یہ حجاب توڑ دیا۔ اب اس کی بچیاں، شاہ جی کی بچیاں تھیں اور منور کے غائب ہونے کے بعد، تو شاہ جی کو ایسا معلوم ہونے لگا تھا۔ کہ منور ان کا بچہ نہیں۔ انہوں نے کسی مسافر عورت سے بیاہ نہیں کیا تھا۔ وہ فاطمہ سے بیاہے گئے تھے اور فاطمہ نے ان کے لئے یہ بچیاں جنی تھیں۔

اگر کبھی سائرہ، اس شاہ جی بابا کے دل کے اس جذبہ کو معلوم کر پاتی۔ تو شاید انتہائے تحیر اور دیوانگی میں اپنے بال نوچنے لگتی۔ اور پھر کبھی شاہ جی بابا سے یہ نہ کہتی۔ شاہ جی بابا اگر آپ اجازت دیں تو صابرہ اور زہرہ کو میں اپنے پاس لے جاؤں۔

سترھواں باب

اور اندھی صابرہ اور کم سن زہرہ کو تو ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے شاہ جی بابا کی صورت میں انہیں ماں اور باپ دونوں مل گئے ہیں۔ اور ان کے معصوم دلوں کے غم دن پر دن ہلکے ہو رہے تھے۔

مگر اندھی صابرہ کا یہ غم اس وقت اچانک اس کے دل کے آسمان پر ایک خوفناک بادل بن کر چھا گیا۔ جب غلام محمد چوکیدار نے، ایک شام گڑ کی بھیلی صحن میں رکھتے ہوئے صابرہ سے کہا:۔

" صابرہ بیٹی! نہ جانے مجھے کچھ وہم سا ہوا ہے۔ یا حقیقت ہے۔ رات پچھلے پہر جب میں پہرہ دیتے دیتے اپنے مکان کی پچھلی دیوار کے ساتھ سے گزرا تو مجھے ایک سایہ سا تمہارے کمرہ کی کھڑکی سے قریب نظر آیا — اور شاید وہ منور تھا، اس کے کپڑے پھٹے ہوئے تھے اور بال الجھے الجھے سے!، اور جیسے ہی میں اس کے قریب پہنچا، آواز دی تو وہ سایہ دیوانوں کی طرح اچھلا اور ایک چھلاوے کی طرح میری نظروں کے سامنے سے غائب ہو گیا۔ میں بہتیرا بھاگا، مگر وہ تو فضا میں کھو گیا تھا۔ میرے ہاتھ نہ لگا۔"

اور صابرہ، یہ ساری بات سن تک نہ سکی۔ اور کچھ ایسی بے خود ہوئی۔ کچھ ایسی کھو سی گئی

کہ اس نے ایک حرف تک نہیں کہا، چوکیدار سے یہ تک نہ پوچھا۔

چوکیدار! وہ یہاں کیا کرنے آئے تھے، اس رات اس سے کھانا بھی نہ کھایا گیا شاہ جی بابا اور زہرہ نے آپ اپنے ہاتھوں سے لقمے بنا بنا کر اس کے منہ میں ڈالے مگر ہر بار اس نے یہ لقمہ تھوک تھوک دیا، اسے تو اپنا حلق سِلا ہوا معلوم ہو رہا تھا۔ اس کا تو تھوک تک اس حلق میں سے نیچے نہ اتر سکتا تھا۔

یہ بالکل ایک عجیب قسم کا بوجھ تھا اور ایک نرالی اذیت تھی۔ جو اس کی روح، اور روح کے ساتھ ساتھ جسم کی تمام رگوں اور نسوں کو سکیڑے جا رہی تھی۔

وہ اس رات سو تک نہ سکی ــــ اور پھر، اس کی بعد کی راتیں تو اس کے لئے دہکتے ہوئے دوزخ کی صورت اختیار کر گئیں۔

اور شاہ جی بابا کا یہ اطمینان بھی ان سے چھن گیا۔ ذاتی اعتماد کی زنجیر کی یہ کڑی بھی ڈھیلی ہو گئی ــــ وہ اس بی صابرہ کے سامنے بیٹھ کر اپنا بڑھاپا بھول جاتے اور اسے خوش رکھنے اور ہنسانے کے لئے بچوں کی سی حرکتیں کرنے لگتے۔ مگر صابرہ کے ہونٹوں پر نہ کبھی مسکراہٹ آئی اور نہ چہرہ پر چھائی زردی کی کوئی تہہ کم ہوئی۔ اور یہ زردی تو اب اتنی بڑھ گئی تھی کہ صابرہ بی کو دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ ہلدی سے بنی ہے اور اس کا خمیر مٹی کی بجائے زردی سے اٹھایا گیا ہے۔

اور یہ کتنی عجیب بات تھی، کیسی انوکھی کیفیت تھی۔ جسے صرف وہی محسوس کرتی تھی اسے کوئی جان نہ سکتا تھا۔ اور جان کیسے سکتا۔ وہ تو پگلی کسی کے سامنے آنسو تک نہ بہاتی اپنے درد کا دکھڑا نہ کہتی۔ یہاں تک کہ ساترہ آپا بی اور زہرہ دونوں سر پٹخ پٹخ تھکیں، مگر وہ ایک حرف زبان پر نہ لائی۔

ماں نے اسے قرآن حفظ کرا دیا تھا۔ اور یہی ایک سہارا تھا اس کی اس بے کیف زندگی کا
جب اس کا دل اس انوکھے غم کا بوجھ برداشت کرتے کرتے بُری طرح تھک جاتا تو وہ قرآن
کی تلاوت کرنے لگتی۔ اور جب تک تلاوت کرتی رہتی اسے ایسا محسوس ہوتا جیسے اس کا غم
پرے سرک گیا ہو۔ مگر جیسے ہی وہ زبان روک لیتی غم کے پہاڑ کے پہاڑ، طوفان کے طوفان
اس کے دل پر نازل ہو جاتے۔ اور وہ بُری طرح کانپنے لگتی اور کانپتے کانپتے سوچتی!

"اس نے میری بے بسی اور بے چارگی پر رحم کھا کر اپنی جوانی، اپنی خوشی اور دل کی
امنگوں کو دیوانگی کے سپرد کر دیا، مگر یہ نہ جان سکا کہ اس کی اس دیوانگی سے میری حالت
ابتر سے ابتر ہوتی جا رہی ہے۔"

اور یہ بات سوچتے سوچتے اس کا جی چاہتا۔ قدرت کسی طرح چند ساعتوں کے لئے
اسے یہ قوت بخش دے کہ وہ ہوا کے پروں پر اڑتی وہاں جا پہنچے جہاں اس کا یہ دیوانہ ساجن
ٹھیرا ہے۔ اور اس کے پھٹے پھٹے گریبان میں ہاتھ ڈال کر کہے:

"پگلے! یہ تونے قربانی تو کی، یقیناً ایک بڑی قربانی ہے۔ مگر اگر تو یہ قربانی نہ کرتا
اگر تو زبیدہ آپا کا بن جاتا، تو میں بڑی خوش رہ سکتی۔ مجھے تو اسی وقت یہ احساس ہو گیا تھا،
جب میں نے ہوش کی منزل میں قدم رکھا تھا، کہ میں اندھی ہوں اور زندگی کی ہر اس نعمت سے
محروم ہوں جو جوانی کے دربار سے ہر جوان عورت کو ملتی ہے ــ اور جب مجھے یہ احساس تھا
جب میں یہ اچھی طرح جانتی تھی تو پھر تم نے ـــــ مجھ بے بس لڑکی کی خاطر یہ دیوانگی کیوں اختیار کی؟
ــ کیا، یہ تمہاری اچھی بات ہے، کہ تم کسی دیوانے کی ہمدردی میں پاگل ہو جاؤ ــ کسی لُنجے کی
خاطر اپنے ہاتھ توڑ دو اور اندھے کی محبت میں اندھے ہو کر اپنی آنکھیں پھوڑ لو۔"

مگر وہ اتنی لمبی چوڑی داستان تو دیوانے منور سے اس وقت کہہ سکتی جب جابر قدرت

اسے ہوا کے پروں پر اُڑنے کی قوت بخشتی - اور اگر یہ قدرت اس کے حق میں ایسی ہی مہربان ہوتی، تو اس سے اس کی آنکھوں کی بینائی کیوں چھینتی - اسے موٹی موٹی خوبصورت آنکھیں دینے کے باوجود دیکھنے کی لذّت سے محروم کیوں رکھتی - اور یہ تو ستم ظریف قدرت تھی، جو اس کے ساتھ ایک عجیب ستم ظریفی سے کام لے رہی تھی - کیا یہ ستم ظریفیاں کچھ کم نہ تھیں، اسے اندھی پیدا کیا - پھر باپ کے سایہ سے محروم کر دیا - ماں جیسی گراں بہا دوست چھینی اور اب محبوب کو بھی چھین لے گئی - اور پھر دل کے ہر سکھ اور ہر راحت کو ہمہ لرزے اور ہمہ غم کی صورت بخش دی -

اور یہ غم کیا تھا، یہ دُکھ اور اذیت کس قسم کی تھی - یہ تو وہی جانتی تھی جس پر بیتی تھی اور اقبال کے نظریئے کے مطابق اگر کبھی اس اذیت، کبھی اس کرب اور کبھی اس غم کی وادی میں اس قدرت کو اُترنا پڑتا - تو پھر اسے قدرِ عافیت معلوم ہوتی - پھر وہ جانتی کہ جسے وہ ایک کھیل سمجھ کر کھیل رہی ہے ——— وہ کتنا ہولناک، کتنا الم بخش اور کیسا بے ہودہ کھیل ہے۔

مگر ہائے وہ بدنصیب اس جابر قدرت سے شکوہ بھی تو نہ کرتی - وہ اس سے یہ بھی تو نہ پوچھتی، تیری ستم ظریفی کی انتہا اور غایت کیا ہے - وہ تو بس التجائیں اور دعائیں ہی کرنا جانتی تھی اور جب اس کا غم حد سے بڑھ جاتا تو وہ ایک عجیب چیز بن جاتی -

زہرہ سے کہتی، مجھے قرآن دو، اور جب زہرہ قرآن پاک کو اس کے لرزتے لرزتے ہاتھوں پر رکھ دیتی - تو وہ اسے تکیہ پر رکھ دیتی اور اس پر اپنی پیشانی رکھ کر اپنے رب کو اس قرآن پاک کا واسطہ دے کر پکارتی

"اے میرے نبیؐ اس قرآن کے اتارنے والے خدا ——— میرے منوّر کو ہر سکھ اور ہر خوشی دے، اسے میرے پاس نہ لا - اسے آپا زبیدہ کے پاس بھیج دے۔"

اور جیسے ہی وہ یہ دعا مانگتی، نہ جانے کیسے اس کی اندھی آنکھیں اتنی دُور بیٹھے بیٹھے

آیا زبیدہ کے دل میں اُتر کر اس کی حالت جان لیتیں۔ شاید اس لئے کہ وہ خود محبت میں مبتلا تھی اور جانتی تھی کہ محبت کے دوزخ میں جلنے کا کرب کتنا اندوہناک ہوتا ہے۔ وہ خود غرض نہ تھی وہ اپنی بھلائی اور اپنا سکھ نہ چاہتی تھی۔ وہ تو زبیدہ اور منوّر کی خوشی مانگتی تھی۔ وہ تو ان کی جوانیوں۔ ان کے شاداب حسنوں اور رعنائیوں کی خیر چاہتی تھی۔ مگر یہ رعنائیاں اور یہ حسن تو ماند پڑ چکے تھے اور یہ جوانیاں تو ذہنی بڑھاپے کی نذر ہو چکی تھیں۔ مگر یہ بھی کتنی بے بسی تھی اس احمق کی کہ اسے زبیدہ کی بے بسی اور بے چارگی کا تو علم تھا مگر ــــ وہ منوّر کے بارہ میں کچھ نہ جانتی تھی اور غلام محمد چوکیدار نے اس سے اپنا ایک وہم کہہ کر یہ محض اس کی تشویش جگا دی تھی۔ بیٹھے بیٹھے، اس کے دل میں ہزار دوزخ لیسا دیئے تھے۔ اور یہ دوزخ بھڑک بھڑک کر اس کے دل کے کناروں کو کھائے جا رہے تھے۔ اور اگر اسے سچ مچ منوّر کی حالت کا علم ہو جاتا۔ ذرا اگر وہ جان جاتی کہ منوّر کس دوزخ میں جل رہا ہے۔ تو وہ ایک لمحہ بھی جی نہ سکتی اور آپ اپنے زرد زرد اور کمزور ہاتھوں سے اپنا گلا گھونٹ لیتی۔

اٹھارھواں باب

اور منوّر دیوانہ اور پگلا منوّر اپنے پگلے پن کے زور اور اندرونی اضطراب کی بناء پر ہرہ پہاڑی کی وسعتوں کو پھلانگتا، کانگڑہ ویلی کے اس حصّہ میں جا پہنچا تھا، جہاں موجودہ تہذیب کا کوئی نشان ابھی تک پہنچ نہیں پایا اور جہاں کے لوگ ابھی تک ویسے ہی وحشی ہیں، جیسے مسیح کی پیدائش کے وقت تھے۔

اس کے سارے کپڑے پھٹ چکے تھے اور جسم کا عضو عضو زخمی ہو چکا تھا۔ اور اس پر ایک ایسا عالم طاری تھا جس میں آدمی اپنی دیوانگی کے باعث کسی تکلیف اور درد کا احساس نہیں کرتا۔ اور اسی دیوانگی کے عالم میں، وہ ایک ایسی عورت کی گرفت میں آن پھنسا جو یوں تو عورت تھی، مگر اس کے سینہ میں ہلاکو خاں کا دل اور ہاتھوں میں چنگیز کی سی سفاکی اور بربریت تھی۔ وہ اس علاقہ کی سب سے زیادہ جابر اور سب سے زیادہ قوی عورت تھی۔ پچیس مربع میل کے رقبہ میں بسنے والے پہاڑی باشندے اس کا نام سنتے ہی کانپ اٹھتے، وہ تو ایک طوفان تھی قدرت کی طرف سے عورت کے جسم میں بندھا ہوا طوفان۔ وہ طوفان کی صورت میں اپنی بستی سے نکلتی، اور اپنے خونیں جبڑے پھیلائے تیس تیس چالیس میل کے رقبہ میں پھیل جاتی۔ اور جب لوٹتی تو اس کے ساتھ گاڑی، بھینسوں، بیلوں، بکریوں اور بھیڑوں کے ریوڑ کے ریوڑ ہوتے

اور اس کے ساتھی جن میں آدھی عورتیں تھیں اور آدھے مرد، شیروں اور چیتوں کی کھالیں پہنے قوی ہیکل گھوڑوں پر سوار، ان ریوڑوں کو اس طرح ہنکاتے ہوئے اس کے پیچھے پیچھے آتے، جیسے، اس عورت کو سردار مان کر وہ اس سارے علاقہ کے مالک و مختار بن گئے ہیں درندگی ان کا پیشہ تھا۔ اور وحشت و آوارگی ان کا مذہب تھی۔ انہیں کسی چیز پر اعتقاد نہ تھا

اور یہ عورت شاید کسی دیو یا حضرت شیطان کی نسل سے تھی کہ اسے دیکھ کر اس پر عورت کا گمان نہ ہوتا۔ اس میں عورت پن کی کوئی بات بظاہر نظر نہ آتی۔ اس کا قد چھ فٹ لانبا، جسم پہلوانوں کی طرح گٹھا ہوا اور بازو بہت مضبوط تھے۔

اور اس شام جب منوّر اس کی اور وہ منوّر کی زندگی میں داخل ہوئی۔ سورج ابھی غروب نہیں ہوا تھا۔ اس کی لال لال سنہری کرنیں چیل کی شاخوں سے اٹھکیلیاں کرتی نیچے بہتی ندی کے شفاف پانی پر پڑ رہی تھیں۔ بدنصیب منوّر اس ندی کے کنارے گرا پڑا تھا۔ جب یہ عورت، اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ شکار کھیلتی اپنے گھوڑے کو پانی پلانے یہاں پہنچی، سفاکی اور بربریت کی اس عادی عورت نے، اس نوجوان منوّر کو اس بُری طرح بے ہوش پایا تو اپنی فطرت کے بالکل خلاف گھوڑے سے کود پڑی، اور اس منوّر پر جُھک گئی۔ اور اسے زور زور سے جھنجھوڑنے لگی، مگر منوّر کے حواس اس جھنجھوڑنے سے بھی اپنی جگہ پر نہ آئے۔ نہ جانے یہ اس عورت کی مامتا تھی یا اس کا عورت پن جاگ اُٹھا تھا، کہ وہ اس کے قریب بیٹھ گئی۔ اور اس کے زخمی اور لہولہان جسم پر بڑی محبت سے ہاتھ پھیرنے لگی۔ اس نے اس کے دل پر ہاتھ رکھ کر اس کے دل کی ضربات سنیں۔ دِل پوری شدّت کے ساتھ دھڑک رہا تھا، مگر دماغ بری طرح سویا پڑا تھا۔

اس جابر عورت نے دفعتاً اپنی زندگی کی روایات بدل ڈالیں، بجلی کے ایک دھچکے کے ساتھ

منور کو اُوپر اٹھایا، اور اپنی راہ آگے بڑھنے لگی۔

اس کے سارے ساتھی (مرد اور عورتیں) جو اسی کی طرح سفاک اور خونی تھے اس کی اس حرکت پر بُری طرح حیران تھے اور یہ حیرت کی بات ہی تھی۔ اس عورت نے آج تک کبھی کسی زخمی، کبھی کسی اپاہج اور کبھی کسی کمزور اور بےبس پر رحم نہیں کھایا تھا۔

یہ بالکل پہلا واقعہ تھا۔ اپنی نوعیت کا پہلا حادثہ، مردوں نے گھوڑوں پر بیٹھے بیٹھے، ایک دوسرے سے قریب ہو ہو کر ایک دوسرے سے سرگوشیاں کیں اور عورتوں نے، ایک دوسری کے بازو میں چٹکیاں لیں۔ مگر وہ جس کے بارہ میں یہ سب کچھ ہو رہا تھا بےہوش منور کو اپنے آگے ڈالے گھوڑے کو سرپٹ بھگائے جا رہی تھی۔

اور نہ جانے کیا بات تھی، کہ اس منور کے نازک نازک جسم کو اپنی گود میں بھرے اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا، جیسے اس کے اندر کوئی نئی رگ پھڑکنے لگی ہے۔

بستی آگئی، مگر گھوڑا ابھی تک پُوری رفتار سے آگے کی طرف بھاگ رہا تھا۔ بستی کے لوگ حسب دستور اپنے اپنے دروازوں پر آئے اور رکوع کے بل جھکتے گئے، مگر، مالکہ نے ان میں سے کسی کا سلام قبول نہیں کیا۔ اور سب دم بخود کھڑے کے کھڑے رہ گئے۔

اپنے قلعہ نما مکان کے بڑے دروازہ پر پہنچ کر البتہ اس کا گھوڑا رکا۔ پہرہ دار نے برق کی سی سُرعت کے ساتھ دروازہ کھولا، اور گھوڑا اندر بڑھا، اور پتھروں کی ایک لمبی دیوار کے ساتھ ساتھ بھاگتا، ایک وسیع باغیچہ میں سے گذرتا، ایک کھلی بارہ دری کے قریب جا پہنچا۔

باندیوں اور غلاموں نے آگے بڑھ کر سلامی دی اور مالکہ کے آگے سے یہ بوجھ اٹھانا چاہا۔ مگر اس نے یہ بوجھ کسی کو نہیں سونپا۔ بوجھ کو خود اپنی گود میں بھر کر نیچے کو دی، اور اسے ایک بڑی مسند پر لا ڈالا۔

اس کے جسم سے اس کے دریدہ کپڑے اتار دیئے گئے اور اسے باریک اون کی ایک نرم عبا پہنا دی گئی ۔

مالکہ ابھی تک کھوئی کھوئی سی تھی ۔ ابھی تک اس نے اپنا خونیں لباس نہیں اُتارا تھا اس کی کمر میں خنجر اور بغل میں زہریلے پھلوں والے تیروں سے بھرا ہوا ترکش لٹک رہا تھا ۔ بڑی باندی نے آگے بڑھ کر یہ چیزیں اس کے جسم سے اتارنا چاہیں ، تو وہ بادل کی طرح گرجنے لگی اور باندی بُری طرح کانپ اُٹھی ۔

مالکہ ابھی تک کھوئی کھوئی سی تھی اور سوچ رہی تھی ۔ کیا میری زندگی کی بنجر کھیتی میں یہ بے ہوش لڑکا ۔ محبت کا پودہ لگانے آیا ہے ۔ اور کیا میری دادی ، اس نوجوان کو اس کے پاس بھیج کر اس کی سفاکیوں اور سنگدلیوں کا انتقام لینا چاہتی ہے ! جیسے ہی یہ خیال اس کے ذہن میں آیا ۔ اس نے کمر سے خنجر کھینچ لیا ۔ اور بڑی بربریت کے ساتھ آدھی رضائی منور کے جسم پر سے ہٹا دی ۔ مگر نہ جانے اس منور کے چہرہ میں کیا جاذبیت تھی کیا سحر تھا ۔ کہ اس کا وہ ہاتھ کانپ اُٹھا جس میں خنجر پکڑا تھا ۔

اس نے وہ خنجر زمین پر پٹخ دیا ۔ اور خود جہاں کھڑی تھی وہیں بیٹھ گئی ۔ اور اپنا سر دونوں ہاتھوں سے پکڑ لیا ۔

اور منور کا چہرہ ابھی ننگا تھا ۔ اور کتنی نزاکت تھی اس کے چہرہ پر ، جیسے بڑی باندی اور دوسری باندیوں نے اپنے ہونٹ کاٹ کاٹ لئے ۔ اور مالکہ ابھی تک اپنا سر پکڑے بیٹھی تھی شاید وہ سنبھل گئی تھی ، یا اس نے اپنا ارادہ ملتوی کر دیا تھا کہ اس کے ہاتھ پیشانی سے ہٹ گئے ۔ اور اس نے ایک نظر پھر منور پر ڈالی ۔

پہلے اس نے اس چہرہ کو اچھی طرح نہ دیکھا تھا ۔ مگر اب دیکھ رہی تھی ۔ منور کی لانبی

لانبی موٹی موٹی آنکھیں کانوں کی طرف پھیلی تھیں اور گھنی اور لمبی پلکیں، ان موٹی اور لانبی لانبی آنکھوں کے کناروں پر اس طرح کھڑی تھیں جیسے پہرہ دے رہی ہوں۔ اور ہونٹ تو اس ظالم کے کتنے باریک ننھے بالکل گلاب کی پتیوں جیسے اور بال تو بالکل سنہری تھے جیسے ریشم کے گچھے ہوں۔

اور اس وحشی عورت نے ایسا کھلونا کب پایا تھا۔ ایسی چیز کب دیکھی تھی۔ اس کی حالت اس وقت تو وہی تھی جیسے کسی وحشی اور دیو قسم کے سیاہ فام قوی ہیکل مرد کو کوئی پری زاد، نازک نازک خوبصورت کم سن عورت مل جائے۔

اس کے ہونٹوں پر آپ ہی آپ مسکراہٹ کھیل گئی۔ اور اس نے بڑی باندی کو حکم دیا شیر کی چربی گرم کرکے لائے۔ اور جب یہ چربی آگئی۔ تو وہ منور کے سارے جسم پر آپ اپنے ہاتھوں سے مالش کرنے لگی۔ اور اس مالش کے وقت اس کے ہاتھ ایسے جسم میں عجیب قسم کی چیونٹیاں سی رینگیں اور اس کی نس نس اور رگ رگ کو جھپڑ کاٹنے لگیں۔ اور یہ چیونٹیاں اچانک اپنی جون بدل گئیں۔ اور ایک برقی رو کی صورت اختیار کرلی۔ اور اس برقی رو نے اس کے جسم کی سرکرختگی اور درندگی جلا ڈالی۔ اور وہ بے اختیار چاہنے لگی، یہ حسین نوجوان جاگ جائے۔ مگر یہ حسین جوان ابھی جاگنے کے قابل نہیں ہوا تھا۔ اس مالش نے گو اس کے جسم کی تھکاوٹ اور سوجن کم کردی تھی۔ مگر دماغ اور دل کی سوئی ہوئی رگیں اور نسیں بے کار نہ ہوئی تھیں اور وہ دیوانہ وار آگے کی طرف بھاگتا، کبھی رکتا، اور کبھی آپ ہی آپ لیٹ جاتا رہا تھا۔ اسے جنگل کے کسی درندے نے کچھ نہیں کہا تھا۔ کسی زہریلے بچھو یا سانپ نے نہیں ڈسا تھا۔ شاید یہی اس کی دیوانگی کی تھی۔ جو اسے یہاں تک صحیح سالم لے آئی تھی ورنہ نہ جانے۔ رستہ کے درندے اور زہریلے ناگ اس کے جسم کی کیا حالت کرتے۔

رات ہوگئی تھی اور سردی اس قدر بڑھ گئی تھی کہ خود ان جنگلی درندوں کے جسم کپکپاہٹ

محسوس کرنے لگے تھے ۔ مالکہ اٹھ بیٹھی اور اپنے دونوں بازو منوّر کے جسم کے گرد ڈال کر اسے مسند پر سے اٹھا لیا اور پچھلے دالان میں لے گئی ــــ اور بڑی باندی کو حکم ملا ، آتش دان میں آگ جلائے ، اور جب تک آگ جلتی وہ منوّر کے سر میں تیل ملنے لگی ۔ اس منوّر کے یہ بال کتنے نرم تھے اور ان کا رنگ کتنا سنہری تھا ۔

اور نہ جانے کیسے اس کے بالوں میں تیل ڈالتے ڈالتے اس کے ہاتھ اس کی آنکھوں اور گالوں پر دوڑنے لگے اور وہ ایک نئی لذت پانے لگی ۔

اس کی عمر تیس سال سے اوپر ہو چکی تھی ، کرختگی اور درندگی اس نے اپنے جابر باپ سے ورثہ میں پائی تھی ۔ اور اس نے جب سے ہوش سنبھالا تھا ، اس کے دل میں کبھی کسی مرد کی خواہش پیدا نہ ہوئی تھی ۔ وہ مردوں سے کشتی لڑتی ۔ ان کی گردنوں پر چھریاں پھیرتی ۔ ان کے جسموں کو نیزوں سے چھیدتی اور ان کی نعشوں کو پاؤں تلے روندتی رہی ۔ اور ایک لمحہ اور ایک ساعت کے لئے اس نے اپنے جسم کے کسی حصّہ میں یہ کمزوری نہ پائی تھی ۔ جو آج اچانک اس کے جسم کے ہر حصّہ پر مسلط ہو گئی تھی ۔ اور نہ جانے اس کا جی کیوں چاہ رہا تھا کہ وہ اس چھوکرے کو گود میں بھر کر بیٹھ جائے ۔

مگر وہ پچیس میل لمبی اور تیس میل چوڑی ریاست کی حکمران تھی ، آزاد اور خود مختار حکمران اس کا سر کسی بڑی سے بڑی طاقت کے سامنے نہیں جھکا تھا ۔ اور نہ اس کے اندر کسی قسم کی کمزوری پیدا ہوئی تھی ۔ اور یہی سبب تھا کہ وہ عورت ہونے کے باوجود مردوں پر نہ صرف حکومت کرتی بلکہ جسمانی مقابلوں میں ہمیشہ ان سے جیت جاتی ۔

ابھی تک اس کے ہاتھ منوّر کے گالوں ، ہونٹوں اور آنکھوں پر پھر رہے تھے ۔ بڑی باندی نے آگ روشن کر دی اور اجازت چاہی کہ کھانا حاضر کرے ۔ مگر کھانے کی بھوک کسے تھی ۔ ایک نئی خلش پیدا ہو گئی تھی ایسی خلش جو ہر قوت اور ہر غرور کی شکست بن جاتی ہے ۔

اور وہ ابھی کسی شکست اور کسی کمزوری کے لئے تیار نہ تھی۔ اس نے ایک جھٹکہ کے ساتھ اپنے ہاتھ اس منوّر کے چہرے سے ہٹا لئے اور باندی کو حکم دیا۔

"گھی گرم کر کے لائے اور اس چھوکرے کے مُنہ میں ٹپکائے"

اور یہ حکم دے کر آپ اپنے خاص کمرہ میں بڑھ گئی۔

جسم سے ہتھیار کھول دیئے اور شیر کی کھال کی پوستین اتار ڈالی اور اپنی مسند پر گر پڑی آج وہ بڑی مضمحل تھی۔ آج اس کے اندر دو عجیب قوتیں لڑ رہی تھیں۔ اس کے سینہ کے اکھاڑہ میں آج ایک بڑا دنگل ہو رہا تھا۔

اور یہ دنگل اس وقت تک ہوتا رہا۔ جب تک بڑی باندی نے اندر قدم نہیں رکھا، اور اسے آواز نہیں دی۔ اس نے اپنی آنکھیں کھول لیں اور ادھر دیکھا۔ باندی کے ہاتھ میں کھانا تھا اس نے یہ کھانا اس کے سامنے رکھ دیا۔ اور اس نے باندی کی طرف دیکھے بغیر پوچھا۔

کیا وہ چھوکرہ ابھی ہوش میں نہیں آیا۔

باندی نے جواب دیا "ہوش میں تو نہیں آیا، البتہ آپ ہی آپ کروٹ بدل لی ہے اور جیسے یہ بات سُن کر، مالکہ کے دل میں خوشی کی ایک عجیب لہر دوڑ اُٹھی۔ مگر وہ بڑی ضدی تھی اس نے چاہا۔ اس کے اندر دوڑ اُٹھنے والی یہ رو ایک دم رک جائے۔ مگر وہ رو تو برابر دوڑ رہی تھی اور اس کے دل کی ہر رگ کو نچانا شروع کر دیا تھا۔ وہ بے حد بے چین ہو گئی۔

وہ پلنگ پر سے اُٹھ بیٹھی۔ باندی کی طرف دیکھا اور سر جھکا لیا۔ اور اس کی یہ باندی، پندرہ سال سے اس کی خدمت کر رہی تھی۔ اور اس سارے قلعہ میں یہی ایک عورت تھی جو اس کے مزاج کو سمجھتی تھی۔ اور اس باندی نے آج اس وقت اس کی اس تبدیلی کو پا لیا تھا۔ جب وہ منوّر کو گود میں بھر کر گھوڑے سے کودی تھی۔ اور پھر جب اس بڑی باندی نے اسے منوّر کی زلفوں سے

کھیلتے اور اس کے جسم کی مالش کرنے پایا تھا۔ تو وہ اندر ہی اندر بڑی خوش ہوئی تھی۔ وہ اپنی مالکہ کی اس خشک اور مردوں جیسی کھُردری زندگی سے بڑی تنگ آ گئی تھی اور یہی سبب تھا کہ اس نے ابھی تھوڑی دیر پہلے منوّر کے سارے جسم پر مشک مل دی تھی۔ اور اسی لئے اپنی مالکہ کو آن کر یہ جھوٹی اطلاع دی تھی کہ منوّر نے کروٹ بدل لی ہے۔ حالانکہ منور نے کروٹ نہیں بدلی تھی۔ ابھی اس کا جسم اپنے اوپر اتنا مختار نہیں ہوا تھا کہ آپ حرکت کر سکے۔

وہ دونوں ایک دوسرے کے سامنے کھڑی تھیں۔ اور دونوں کچھ سوچ رہی تھیں۔ مالکہ یہ سوچ رہی تھی کہ اس چھوکرے کو وہاں سے کیوں لائی۔ اور اگر وہ اسے نہ لاتی تو اس کی زندگی میں یہ نئی قیامت نہ جاگتی۔ مگر جیسے ہی اس نے یہ سوچا اس کا دماغ آپ ہی آپ کانپ گیا۔ اور اسے اچانک یہ خیال آیا، اگر وہ اسے اٹھا کر نہ لاتی تو اسے درندے کھا جاتے۔ اور اپنے اس خیال پر وہ اپنی ساری بربریتوں اور سفاکیوں کے باوجود کانپ اٹھی — اور اپنا مُنہ اپنے دونوں ہاتھوں میں چھپا کر پھر پلنگ پر بیٹھ گئی۔

بڑی باندی نے اپنی زندگی میں خود محبت کی تھی اور گو بوڑھی ہو گئی تھی، مگر اس کی رُوح ابھی تک ان لذتوں کو نہ بھُولی تھی جو اسے محبت کے دربار سے ملی تھیں۔ اور اسے معلوم تھا کہ ہر نوجوان عورت پر کسی نہ کسی وقت وہ لمحہ ضرور آتا ہے جب اس کا سارا جسم، مرد کے آغوش میں سمٹنے کے لئے بے قرار ہو جاتا ہے۔ خود اس پر بھی تو یہ لمحہ آیا تھا۔ خود وہ کتنی مغرور تھی۔ بستی کے کسی مرد کی طرف آنکھ اٹھا کر نہ دیکھتی لیکن جب رنگیلے نے، سرِ شام لوگوں کے سامنے ہی اس کی ایک گستاخی پر اس کے مُنہ پر ایک چانٹا لے مارا۔ تو اس نے بڑے غصّے کے ساتھ اسے دیکھا۔ مگر یہ بدمعاش رنگیلا مسکرا رہا تھا۔ اور اس کا جوان چہرہ، بھرے بھرے بازو اور لمبا جوان جسم تو قہقہے مار رہا تھا اور نہ جانے اس کی نسائیت نے اس کے جوان جسم کے یہ قہقہے کیسے سُن لئے تھے۔ اس کا سارا غصّہ جاتا رہا تھا

اور اس کی آنکھوں میں ایک عجیب چمک پیدا ہو گئی تھی۔

آج یہی چمک ابھی ابھی اس کی مالکہ کی آنکھوں میں بیٹھی، اس سے، چیخ چیخ کر کہہ رہی تھی

"میری نسائیت بھی جاگ اٹھی ہے۔ اور اس پر بھی وہی لمحہ آ گیا ہے، جس سے وہ آج اپنی حماقت کے باعث بھاگتی رہی۔ مگر اب بھاگ نہیں سکتی۔"

بڑی باندی۔ اس کے پلنگ کے قریب آن کھڑی ہوئی تھی اور اس نے مالکہ کے دونوں کندھوں پر اپنے ہاتھ رکھ دیئے تھے۔ اور مالکہ اس طرح چونک پڑی تھی جیسے کوئی ان ہونی بات ہو گئی ہو اور نہ جانے کیسے باندی کی آواز کانپی۔

"مالکہ ـــــ یہ بڑا سُندر جوان ہے جیسے تمہاری جوانی آج اپنے ساتھ لائی ہے۔"

مالکہ نے اپنے کندھے جھٹک دیئے اور کسی قدر تلخی کے ساتھ بولی:۔

"مگر تم یہاں کیوں کھڑی ہو۔ بھاگ جاؤ یہاں سے اور باندی اس کے غصہ سے باخ تھی۔ وہ کانپتی کانپتی وہاں سے بھاگ نکلی اور مالکہ نے اپنے سر کے بال نوچ لئے۔ اور اپنا سر دیوار سے دے دے مارا۔

اور ادھر منوتر۔ ہوش و حواس کی منزل میں آن پہنچا تھا۔

اس مشک نے، جو باندی نے اس کے جسم اور چہرہ پر مل دیا تھا۔ اس کے دماغ کے سارے بند دروازے کھول دیئے تھے۔ اس کی آنکھیں کھل گئی تھیں۔ خوشبو کو محسوس کرنے لگا تھا اور ادھر اُدھر سر گھما کر اس طرح دیکھ رہا تھا، جیسے وہ عالمِ بیداری میں کوئی انوکھا خواب دیکھ رہا ہے۔ اسے وہ وقت اور وہ کیفیت یاد آنے لگی تھی۔ جب وہ بے بس اور لاچار ہو کر ندی کنارے گر پڑا تھا۔ اور جیسے ہی یہ وقت اسے یاد آیا۔ اس کا دماغ بُری طرح سہم گیا۔ وہ ڈرا کہیں لوگوں نے اسے بے ہوشی میں پکڑ کر، پھر ذیلدار کے ہاں تو نہیں پہنچا دیا۔ اس نے ڈرتے ڈرتے

چاروں طرف دیکھا، مگر یہ کمرہ تو عجیب قسم کا تھا۔ ہر دیوار پر شیروں، چیتوں کی کھالیں اور سر لٹک رہے تھے۔ اور ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے، دیواروں پر لگی ان کھالوں اور سروں میں جان پڑ گئی ہے۔ اور یہ سب کے سب اس پر یورش کرنے والے ہیں۔ اس نے سہم کر آنکھیں بند کر لیں اور نہ جانے کیوں اس کی آنکھیں بہہ نکلیں۔ شاید اسے یاد آیا، وہ اس بستی میں نہیں ہے، جہاں اس کے بابا اس کی صائرہ اور اس کا گھر ہے۔ یہ تو بالکل کوئی عجیب جگہ ہے جہاں کی ہر چیز ہی نئی ہے۔

اور ابھی اس نے ان سب چیزوں سے زیادہ نئی چیز نہیں دیکھی تھی۔ اور یہ نئی چیز فضا کے دھندلکے کو چیرتی اپنے ہاتھی جیسے جسم پر اپنی سیاہ زلفیں پھیلائے، ایک ریشمی اوڑھنی میں لپٹی اس کے سرہانے آن کھڑی ہوئی تھی۔ اور اس کی ساری زندگی اور سفاکی، عورت پن میں تبدیل ہو گئی تھی۔ اس کے ماضی نے حال سے شکست کھالی تھی۔ اور اس چھوٹے سے نوجوان لڑکے کے سرہانے اس طرح کھڑی تھی جیسے اس سے چیخ چیخ کر کہہ رہی ہو:۔

"تم نے اپنا چلن بدل ڈالا ہے اے سندر نوجوان اپنی آنکھیں کھول اور یہ انقلاب دیکھ۔"

اور منوّر کا دماغ ابھی تک سہما سہما سا تھا اور آنکھیں بند تھیں۔ اور یہ آنکھیں اس وقت آپ ہی آپ کھل گئیں۔ جب اس ہاتھی جیسی عورت نے اپنا سر جھکا کر اس کی پیشانی چوم لی۔

اور منوّر ایک جھٹکے کے ساتھ اٹھ بیٹھا اور اس عورت کو دیکھا۔

اس کے سامنے دیو کا دیو کھڑا تھا۔ اور اس دیو نے اس کے جاگتے دماغ کو پھر ایک عجیب ڈر کے چنگل میں دے دیا۔ اور وہ عجیب لرزے کے ساتھ سوچنے لگا، وہ نہ جانے کہاں آن پھنسا ہے۔ مگر جب اس دیوئی عورت نے اس کے قریب بیٹھ کر اسے اپنی آغوش میں لے لیا تو اسے محسوس ہوا ــــ یہ تو ایک عورت ہے۔

انیسواں باب

اور یہ سفاک اور جابر عورت ، دوسرے ہی دن ، ایک عجیب نزاکت پسند عورت بن گئی تھی۔ اس کے کمرہ میں سے ، مشک کی لپٹیں اُمڈ رہی تھیں۔ اور اس نے ، ایک عجیب قسم کے ریشم کا سنہرا انگرکھا پہن رکھا تھا۔ اس کے جسم کی ایک ایک رگ اب نسائیت کے دھارے پر بہہ نکلی تھی اور اسے محسوس ہو رہا تھا کہ اس کی زندگی کے تیس سال محض وحشت میں کٹے ہیں۔ صرف ایک رات نے اس میں اتنا بڑا انقلاب پیدا کر دیا تھا۔ اور یہ انقلاب صرف اس کی اپنی ذات تک محدود نہ رہا۔ قلعہ کی ایک ایک دیوار ، ایک ایک اینٹ ، اور ایک ایک چیز سے پھُوٹ نکلا تھا ——— وہ جیسے ہی اپنے سونے کے کمرہ سے نکل کر بارہ دری میں آئی۔ اس کی لانبی لانبی زلفیں اس کے کاندھوں پر سے ہوتی اس کی مضبوط پیٹھ پر لہرا رہی تھیں۔ بڑی باندی نے اس میں پھولوں کے رس سے تیار کیا ہوا تیل ڈال دیا تھا۔ اور جب وہ بارہ دری میں ٹہل رہی تھی تو آس پاس پھیلی باندیوں کو ایسے محسوس ہوا جیسے ان کی مالکہ بالکل کوئی نئی مخلوق ہے۔ اب وہ اپنے لانبے لانبے مضبوط اور قوی جسم کے باوجود ایک عورت تھی۔ نفاست پسند اور خوشبو میں بسی ہوئی عورت۔ اس کی موٹی موٹی خونیں آنکھوں میں ، اب درندگی کی وحشت اور ڈراؤنا پن نہیں تھا۔ نسائیت کی مستی اور جوانی کی چمک تھی۔ اور وہ ان کے سامنے اس طرح ٹہل رہی تھی جیسے اس کے جسم میں ہزار بہاریں سما گئی ہیں۔ اور یہ باندیاں بھی تو عورتیں

تھیں، جوان عورتیں، وہ آپ ہی آپ اپنی اس بدلی ہوئی مالکہ کے سامنے آتے شرما رہی تھیں۔ ان کی ذات، ان کے جسم، اور ان کے کھردرے بے ہنگم اور شیروں اور چیتوں کی کھالوں سے بنے ہوئے دغل ان کی نگاہوں میں خود بہ خود حقیر اور ذلیل ہو گئے تھے۔ وہ ایک ایک کر کے آپ ہی آپ غائب ہونے لگیں۔ اور ان کی مالکہ تنہا بارہ دری میں ٹہلتی رہی۔ وہ شاید سوچ رہی تھی ان باندیوں نے اس کی اس تبدیلی کو پا کر شاید اس سے ڈرنا چھوڑ دیا ہے۔ وہ اس وقت موڈ میں تھی۔ وہ ان کو ڈرانا نہیں چاہتی تھی۔ وہ ان کو ڈانٹ ڈانٹ کر اور ان کی پیٹھوں پر کوڑے برسا برسا کر ان کی آنکھوں سے آنسوؤں کو بہتے اور ان کے ہونٹوں سے چیخیں اٹھتی نہیں سننا چاہتی تھی۔ اس کو تو آج ان کے کھردرے جسموں اور بے ہنگم لباسوں سے گھن آ رہی تھی اور وہ کھڑی سوچ رہی تھی، کیسی بے مروت ہیں یہ باندیاں کہ میری اتنی بڑی تبدیلی سے متاثر نہیں ہوئیں۔

مگر تھوڑی دیر بعد جب ایک ایک کر کے باندیاں پھر اس کے پاس آنے لگیں تو اس کی آنکھیں آپ ہی آپ ہنسنے اور دل قہقہے لگانے لگا۔ اور اس نے سوچا یہ باندیاں بڑی ذہین ہیں اس کے انقلاب کو سمجھ گئی ہیں اور سچ مچ انہوں نے اس کی تبدیلی کو کتنی جلدی محسوس کر لیا تھا۔ اب ان میں سے ہر ایک کی کاکلیں کھلی تھیں۔ اور خوشبو دار تیل میں لبی ہوئیں ان کی پیشانیوں پر لہرا رہی تھیں۔ ان کی آنکھوں میں کاجل اور ہونٹوں پر مسّی کی سرخی تھی۔ اور کئی شوخ تو جو ذرا زیادہ جوان تھیں گالوں پر سنگترے کے چھلکے مل مل کر انہیں لال سرخ کر لائی تھیں۔ اور وہ انگاروں کی طرح دمک رہے تھے۔ وہ سب ہلکے ہلکے شوخ شوخ رنگوں کے لہنگے اور لومڑی کی کھالوں سے بنی ہوئی انگیاں پہنے تھیں۔ اور ان کی مضبوط گردنیں اور گداز سینے، غالباً ان کی غیر معمولی محنت کے باعث، پہلے سے ہزاروں گنا زیادہ جاذب توجہ بن گئے تھے۔ وہ سب مسکرا رہی تھیں۔ ان کی چالوں میں نسائیت کی لچک اور نزاکت پیدا ہو گئی تھی۔ اور دل تو کسی قدر شوخ ہو گئے تھے۔ اور غالباً یہی سبب تھا

کہ وہ اب سب لونڈیں تو سہمی سہمی حالت میں ستونوں سے نہ لگیں۔ مالکہ کے چاروں طرف گھیرا ڈال کر کھڑی ہوگئیں۔ ان سب کی نظریں مالکہ پر جمی تھیں اور مالکہ آج شرما رہی تھی۔ مگر یہ شرم اس لمحہ آپ ہی آپ دور ہوگئی، جب اس کے گرد ڈلا گھیرا ایک مسلسل رقص میں بدل گیا۔ خود اس کے اپنے پاؤں بھی رقص کے لئے تڑپے اور مچلے اور جسم تھرکتے اور ناچنے لگا۔

یہ پہلا رقص تھا، ان کی جوانیوں کا پہلا اور غیر فانی رقص۔ باغ کے وحشی پھول بھی ناچنے لگے تھے۔ درخت پودے۔ کلیاں۔ غنچے۔ حتیٰ کہ بارہ دری۔ اس کے مضبوط ستون اور کھردرے پتھر بھی رقصاں اور لرزاں تھے، اور دور فصیل کے سامنے بنی ہوئی مردانہ بارکوں میں رہنے والے مرد سپاہی پہلے تو اس انقلاب پر سخت حیران تھے۔ مگر پھر وہ بھی ایک دوسرے کی کمروں میں ہاتھ ڈال کر وحشیانہ رقص کرتے نظر آئے۔

اور بڑی باندی ابھی تک منوّر کے جسم پر مالش کر رہی تھی۔ آج اس کی جوانی شاید پھر لوٹ آئی تھی۔ اس نے اس سولہ سال کے جوان چھوکرے کی آنکھوں میں کاجل بھی لگا دیا تھا۔ اور گالوں، گردن اور سینہ پر سنگتروں کے چھلکے بھی مل دیئے تھے۔ وہ ایک مشاطہ بن گئی تھی اور نئی نویلی دلہن کو اپنے مالک کے حضور پیش کرنے کے قابل بنا رہی تھی۔

مگر منوّر ابھی تک کھویا کھویا سا تھا۔ وہ اپنے آپ میں نہیں آیا تھا۔ وہ ابھی بچہ ہی تو تھا۔ سولہ سال کا بچہ۔ گو اس کا ذہن پچھلے ایک سال میں جوان ہو کر بوڑھا بھی ہو گیا تھا مگر عملی طور پر اس نے جوانی کی ان قوتوں کا مشاہدہ نہیں کیا تھا جو مرد کے جسم میں اس وقت برق کی صورت اختیار کر لیتی ہیں۔ جب کوئی جوان عورت اچانک اس سے لپٹ جاتی ہے اور یہ ساری قوتیں رات کے پچھلے حصّہ میں ایک دم اس پر یورش کر آئی تھیں۔ جب مالکہ نے اسے اپنے قوی ہیکل جسم تلے داب دیا تھا۔

وہ ابھی تک اس نشہ کی ہیبت ناکی اور اس برقی قوت کی مقناطیسیت سے آزاد نہیں ہو پایا تھا۔ جو رات اچانک اس کے ناتواں جسم کو جھنجھوڑنے لگی تھی۔

بڑی باندی اسے ابھی تک لٹائے ہوئے تھی اور اپنے کھردرے ہاتھوں سے اس کے پھول کو مسل مسل کر اس خواب سے چونکا رہی تھی۔ ان دونوں نے ابھی تک اس انقلاب کو نہیں دیکھا تھا، جس نے باہر کی بارہ دری میں ایک غیر فانی رقص کی صورت اختیار کر لی تھی۔

اور یہ رقص جب ختم ہوا۔ باندیاں اچھلتی کودتی۔ اپنی اپنی کوٹھریوں کی طرف بھاگیں اور مالکہ ایک نئی حس، ایک نئی تڑپ اور ایک نئی کیفیت کو اپنے جسم کے دامن میں بھرے ان کے کمرہ میں داخل ہوئی۔ تو منور کی پریشان اور مضطرب نگاہ اس سے لڑ گئی۔ اور منور شرما گیا۔ جیسے وہ لڑکی تھی اور سامنے کے دروازہ میں کھڑی عورت اس کا مرد تھا ــــــ وہ مرد جس نے رات اس کے جسم کی بہار لوٹی تھی۔ اور نہ جانے کیسے اچانک اس وقت دو عجیب صورتیں اس کے حافظہ کے فرش پر چھم چھم کرتے رقص کرنے لگیں۔ ان میں ایک زبیدہ تھی۔ جوان اور رعنا زبیدہ، اور دوسری بے بس اور اندھی صابرہ تھی۔ اور دونوں اسے اس طرح گھور رہی تھیں جیسے یہ سامنے کھڑی قوی ہیکل عورت گھور رہی تھی۔ اور اس نے اپنی غلطی پالی۔ اسے اپنے فرار پر ندامت ہونے لگی اور ندامت کا یہ احساس بڑھتا ہی جا رہا تھا کتنا بدنصیب ہے وہ ان عورتوں کو چھوڑ کر اس ہاتھی قسم کی عورت کی گرفت میں آن پھنسا ہے۔

جو اس سے کم و بیش دس گنا زیادہ طاقت ور اور جسیم ہے۔ اور جس کے جسم تلے دب کر رات اس کی سانس کئی بار رک رک گئی تھی، اور جیسے ہی اسے یہ خیال آیا اس کا جی چاہا وہ اس بوڑھی حرافہ کے کھردرے ہاتھوں پر کاٹ لے جو ابھی تک اس کے چہرہ کا طواف کر رہے تھے۔ مگر وہ ان ہاتھوں پر کاٹ نہ سکا۔ البتہ اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ اور ابھی اس کی آنکھوں کو بند ہوئے ایک لمحہ بھی نہ ہوا تھا کہ کھردرے ہاتھ دفعتاً بدل گئے اور ان کی جگہ دو گداز گداز گرم گرم ہتھیلیوں نے لے لی۔ اور

ان ہتھیلیوں میں کتنی گرمی اور کس طوفان کی جلن تھی کہ اسے اپنا سارا چہرہ انگارے کی طرح جلتا محسوس ہوا۔ اور اس نے اس تیزی کے ساتھ جیسے کوئی اپنے جسم پر اچانک آن گرنے والے انگارے کو پرے جھٹک دیتا ہے۔ اپنے نازک نازک ہاتھوں سے ان ہاتھوں کو جھٹک دیا۔ مگر یہ ہاتھ اب اس کی گردن میں پڑ گئے تھے۔ اور اس کی گردن کی رگ رگ جلنے اور چٹخنے لگی تھی۔ اور منور نے چاہا زور سے چیخ اٹھے، مگر سوچنا آسان تھا اور کرنا مشکل۔ اس نے اپنی گردن کو یقیناً کئی جھٹکے دیئے۔ اپنے بازوؤں کو ادھر ادھر پٹخا مگر جب پانچ من کی نعش اپنے پورے بوجھ کے ساتھ اس کے ناتواں اور کمزور جسم پر مسلط ہو گئی۔ تو گو اس کی روح چیختی اور چلاتی رہی مگر جسم کی ہر قوت ایک خوفناک شکنجے میں کس کر اپنا عمل بھول گئی۔

اس کے کان بجنے لگے۔ ایسے جیسے ساری کائنات اس کی بزدلی، اس کی کمزوری کے خلاف احتجاجی نعرے لگا رہی ہو اور اسے چیخ چیخ کر ملامت کر رہی ہو۔

"غیر پختہ دماغ والے کمینے چھوکرے، یہ تو پہلی کڑی ہے، سزاؤں کے اس لمبے سلسلہ کی جو تیرے لئے تجویز ہوئی ہے۔ تو نے دو معصوم عورتوں کی خوشیوں کو نذرِ ماتم کیا تھا —— اس کے بدلہ میں تیری زندگی کی ہر مسرت ہر لمحے اور ہر آن ذبح کی جائے گی۔"

اور اس کے کان ہی نہیں بج رہے تھے۔ جسم بھی چیخ اور چلا رہا تھا۔ اس کے اوپر گری دیو قامت عورت بالکل دیوانی بن گئی تھی۔ اپنے سارے ہوش و حواس کھو بیٹھی تھی۔ اور اس کے نازک جسم کو اس طرح نوچ رہی تھی جیسے ہزار برس کی بھوکی گدھ تر و تازہ نعش کو نوچتی ہے۔ اس نے اس کے نازک نازک بازو۔ نازک نازک سینہ۔ اور گالوں پر دیوانی کتیا کی طرح بہت بری طرح کاٹ کھایا تھا۔ اور اس کے بھیڑیئے ایسے دانتوں نے اس کی جلد میں چبھ چبھ کر لاتعداد زخم کرید کر ڈالے تھے۔ اس کی روح چیخی۔ اس کا جسم چیخا اور زبان پر آہیں اور نالے تڑپے۔ مگر

وہ مالکہ تھی، جابر اور قاہر مالکہ اور اس کے حضور یہ بڑی گستاخی تھی جو اس چھوکرے سے سرزد ہو رہی تھی۔ اور اس جابر اور قاہر مالکہ نے پورے جبر اور پورے قہر کے ساتھ، اپنے دانتوں اپنے خونیں پنجوں، اور اپنے آہنی بازوؤں کے ساتھ اسے اس گستاخی پر ایسی ایسی سزا دی کہ نالے بند ہو گئے۔ آہیں سو گئیں، البتہ آنکھیں بہنے لگیں۔

اور جب اس جبر اور زیادتی سے اس کا بند چھوٹا۔ تو وہ ایک زخمی اور سہمے ہوئے بچے کی طرح اپنی چارپائی پر پڑا کراہ رہا تھا۔ اور بوڑھی باندی آہیں بھر بھر کر اس کے زخمی گالوں، سینہ بازوؤں اور باقی جسم پر شیر کی پگلی ہوئی چربی مل رہی تھی۔

اس کے جسم کی کئی بار سکائی کی گئی۔ روئی کی جلتی جلتی تہیں اس کے سارے جسم پر کئی بار رکھی اور کئی بار اٹھائی گئیں۔ تا آنکہ اس کی روتی آنکھوں اور زخمی جسم پر نیند کی دیوی مسلط ہو گئی

اس شام اس قلعہ میں ہر طرف مشعلیں روشن تھیں۔ دیگیں پک رہی تھیں۔ سالم دُنبے بھُونے جا رہے تھے اور ایک بڑے دائرے میں، تمام بستی کے مرد، عورتیں، ایک دوسرے کی بغل میں باہیں ڈال کر دیوانہ وار ناچ اور چیخ رہے تھے۔

اور ان کے بالکل وسط میں بچھی ایک مسند پر ان کی قوی ہیکل مالکہ روئی کی تہوں اور لمبے سے ریشمی اونی لبادے میں لپٹے منوّر کو اپنی گود میں لئے بیٹھی تھی۔ بڑی رات گئے رقص ختم ہوا۔ ان سب وحشی درندوں نے اس علاقہ میں تیار کی ہوئی دیسی شراب کے جگ کے جگ لنڈھا لئے تھے اور اپنی اپنی عورت سے لپٹے، خر مستیاں کر رہے تھے۔ قلعہ کی ساری باندیاں، لومڑی کی کھالوں کی انگیاں پہنے، اور خوشبو میں لبسے قلعہ کے جواں مردوں کی آغوشوں میں سمٹ گئی تھیں۔

اچانک مالکہ نے بہت زور کی تالی پیٹی، سہمے سہمے منوّر کو گود میں لے کر وہاں سے

اُٹھی ــــــ اور بارہ دری کی طرف بڑھی۔ اور بستی کے لوگ ڈگمگاتے جسموں کے ساتھ قلعہ کے دروازے سے باہر نکلے اور بستی میں غائب ہونے لگے۔ قلعہ کے پہرہ داروں کی آج عید تھی۔ مالک نے انہیں گوشت کے دو دو چار چار من کے لوتھڑے عطا کر دیئے تھے کہ انہیں نوچیں اور کھائیں۔ اور وہ خود منور کو اپنی خواب گاہ میں لٹا کر اسے نوچ اور کھا رہی تھی۔

اور رات چیختی چلاتی بھاگ رہی تھی۔

بیسواں باب

رالعہ کی شادی ہوگئی، بستی کے ایک جوان کسان نے اسے اپنے دامن میں بھر لیا۔ اور اس کی جوانی ایک نئے ساز سے ہم کنار ہوئی ایسے ساز سے جس سے منوّر کے لئے کوئی نغمہ پیدا نہیں ہو رہا تھا۔ مگر بی صابرہ کے جسم کو لگا گھن اس کی ہر توانائی کو اندر ہی اندر کھائے جا رہا تھا۔ زہرہ، ہر صبح ہر دوپہر اس کے بالوں کو گوندھتی، اس کے کپڑے بدلتی۔ اسے خوشبوئیں سنگھاتی اسے صحن میں لا کر نچاتی، خود گاتی، خود ہنستی، خود قہقہے لگاتی کہ صابرہ بی کا دکھی دل بھی اس کی دیکھا دیکھی ناچنے ہنسنے اور قہقہے لگانے لگے، مگر وہاں تو خوشی اس سے روٹھ گئی تھی۔ ہنسی اس سے منہ موڑ گئی تھی اور قہقہے ناراض ہو گئے تھے۔

شاہ جی بابا اب زیادہ وقت کھیتوں پر نہیں کاٹتے۔ انہوں نے غلام محمد چوکیدار کو باغ اور کھیتوں کا انچارج بنا کر سارے کام اس کے سپرد کر دیئے تھے کہ وہ سب کام کرے۔

اور خود اس صابرہ اور زہرہ کی دلجوئی اور دلچسپی کے لئے ہر وقت اور ہر لمحہ ان کے پاس رہتے، زہرہ بچی تھی کبھی کبھی بھیا منوّر کو یاد کرنے لگتی۔ شاہ جی بابا دفعتاً بھڑک اٹھتے اور اس کے منہ پر اپنے بوڑھے ہاتھ رکھ کر اس کو حکم دیتے۔ اس ذلیل چھوکرے کا نام نہ لو۔ زہرہ آنکھوں میں آنسو بھر لیتی اور صابرہ کا سارا جسم، اور اس کے دل کی ہر رگ کانپ اٹھتی۔ وہ بوڑھے

شاہ جی بابا کے ہاتھ پکڑ لیتی اور اپنی دونوں بے بصیرت آنکھیں ان کی طرف اُٹھا کر کہتی :۔

" شاہ جی بابا ! وہ ذلیل نہیں تھا۔ وہ تو ایک الگ کھا وجود تھا اس صفحۂ ارض پر۔ اس نے تو مجھ اندھی کی خاطر اتنی بڑی قربانی کی ہے کہ اس کی مثال نہیں ملتی ۔"

شاہ جی بابا اسے ڈانٹ نہ سکتے تھے مگر جب وہ اس کی اس بات کا جواب دیتے تو ان کے لہجے میں کافی تلخی ہوتی ۔ وہ کہتے :۔

" تم اسے قربانی کہتی ہو اور میں اسے بڑی حماقت سمجھتا ہوں ۔ ایسی حماقت جس کی ہر سزا میرے نزدیک کم ہے ۔ وہ سمجھا اس نے زبیدہ کی جوانی کو راکھ کا ڈھیر بنا کر تم پر احسان کیا ہے ، تمہیں خوشی بخشی ہے ۔ مگر تمہاری رُوح تو ایک ایسے عذاب میں مبتلا ہو گئی ہے جیسا عذاب آج تک کسی عورت کو نہیں دیا گیا ۔"

اور شاہ جی بابا سچ کہتے تھے ، صابرہ ایک بڑے عذاب میں مبتلا تھی ۔ وہ ایک عجیب دوزخ میں جل رہی تھی ۔ اور اس دوزخ میں جلتے جلتے اور عذاب سہتے سہتے اس کے دل کو تازگی بخشنے والی ہر رگ سکڑ گئی تھی ۔ اور جسم ہڈیوں کا پنجر بنتا جا رہا تھا ۔ مگر وہ ایک عام قسم کی عورت تھی ۔ مادر گیتی کی محض سطحی پیداوار اور وہ زبیدہ جو ایک مہینے سے مریم کو ساتھ لے کر پٹھان کوٹ کے زنانہ ہسپتال کے سپیشل وارڈ میں آن ٹھہری تھی ۔ عورت کی تاریخ میں ایک نیا باب لکھ رہی تھی ۔

اس کی خالہ ، جس نے اسے پالا تھا ، اور خالہ کا جوان بیٹا خالد ، صبح و شام اس کے پاس آتے ، غالباً زبیدہ کی ماں ذیلدارنی اور اس کی خالہ کی باہمی سازش کا نتیجہ تھا کہ خالد زبیدہ کی محبت اپنے دِل میں پالنے لگا تھا اور پہلے جسے وہ اپنی بہن سمجھا کرتا ، اب اس سے عشق کرنے پر آمادہ تھا ۔ اور اس شام جب باہر ہلکی ہلکی بارش ہونے لگی تھی ۔ اور بی مریم اپنے کرب

اور بے چینی کی بنا پر کمرہ میں بے ہوش سی پڑی تھی ۔ خالد نے زبیدہ کے دل کے دروازے اِس زور سے کھٹکھٹائے کہ زبیدہ ضبط نہ کر سکی ۔ وہ تو غریب آج صبح ہی سے بہت پریشان تھی رانی مریم نے یوں ہی اسے چھیڑ دیا تھا ۔ کہا تھا ۔ بی بی تم اچھی رہیں ۔ ساجن نہ ملے نہ سہی میری طرح مصیبت میں تو گرفتار نہیں ہوئیں ۔ اس کی اس طنز سے زبیدہ کا دل بہت بُری طرح کٹ گیا ۔ اور آج وہ اس طرح روئی جیسے اس کا منوّرا سے آج ہی چھوڑ کر گیا ہے ۔ مریم اس کی ہم ذوق نہ تھی اور نہ ذہنی اعتبار سے اس کی سطح کی تھی ۔ اگر مریم اس کی ہم ذوق ہوتی تو اُس سے کہتی ، اور چیخ چیخ کر کہتی :-

" اے مریم تو بڑی خوش نصیب ہے کہ تیرے ساجن نے تجھے ایک بڑا تحفہ دیا ہے ۔ اے کاش میرا ساجن ، مجھے ایسا ہی ایک تحفہ دے جاتا اور میں اپنے اس غم کو بڑی خوشی سہتی مگر اب یہ غم تو مجھ سے کسی بہانہ سہا نہیں جاتا ۔ "

مریم کی اس بات کا جواب دیئے بغیر ، وہ باہر کے برآمدہ میں آن بیٹھی اور ابھی اسے یہاں بیٹھے بہت تھوڑی دیر ہوئی تھی کہ خالد آن ٹپکا ، آج وہ خوب بن ٹھن کر آیا تھا ۔ ماں ساتھ نہیں آئی تھی ۔

زبیدہ کی آنکھیں ابھی تک بہہ رہی تھیں ۔ خالد اس کے قریب پڑی کرسی پر بیٹھ گیا اور کسی تمہید کے بغیر پوچھا

زبیدہ یہ تم کب تک اس طرح روؤگی ؟

زبیدہ نے آنسو پونچھ ڈالے جواب دیا

یہ تو عمر بھر کا رونا ہے خالد بھیا ۔

خالد نے اِدھر اُدھر دیکھا جیسے کوئی راز کی بات کہنے والا ہے ۔

مگر زبیدہ جوان لڑکیاں اس طرح رو کر وقت کاٹ نہیں سکتیں۔ انہیں اپنی زندگی میں کسی نہ کسی کو شریک بنانا پڑتا ہے۔

زبیدہ نے کوئی جواب نہیں دیا، اور خالد نے اپنی بات جاری رکھی

تم اپنی خوبیوں سے آگاہ نہیں ہو، تمہیں اپنی رعنائیاں معلوم نہیں۔ اور تم نہیں جانتیں تم کتنا بڑا سرمایہ ہو اس مادرِ گیتی کا۔ تم کتنی بڑی نعمت ہو۔

زبیدہ نے بات کاٹ لی

خالد شاعری نہ کرو۔ میں جتنی بدنصیب ہوں، شاید اتنی کوئی عورت نہ ہو۔

خالد نے کسی قدر مسکراتے ہوئے جواب دیا

سونا اپنی قدر سے واقف نہیں ہوتا۔ موتی کو اپنی ذات سے آگاہی نہیں ہوتی۔ تم خود کو اپنی نظر سے نہ دیکھو، میری نظر سے دیکھو۔ میں تمہیں کیا سمجھتا ہوں، اور یہ تمہاری نہیں میری بدنصیبی ہے کہ تم مجھے اپنے دل میں جگہ نہیں دیتی۔

زبیدہ نے اپنا منہ پھیر لیا۔ اور اس کی موٹی موٹی خوبصورت آنکھوں میں آنسوؤں کی ندیاں جوش مارنے لگیں۔ وہ اس خالد کو کیا کہتی۔ وہ اس کی خالہ کا اکلوتا بیٹا تھا۔ اور دونوں ایک ساتھ پل کر جوان ہوئے تھے۔ وہ خالد کو آج تک سرفراز جیسا بھائی سمجھتی۔ مگر یہ خالد تو حد سے بڑھ گیا تھا۔ اور اس مقدس رشتے کو توڑ دیا تھا جس کا وہ ہمیشہ احترام کرتی رہی۔ مگر خالد تو نہ جانے آج کس ارادہ کے ساتھ آیا تھا۔ اس نے زبیدہ کی روتی آنکھوں کو نہیں دیکھا۔ آگے بڑھ کر اس نے اس کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لئے۔ زبیدہ کانپ اٹھی۔ اس کی بہتی آنکھیں رک گئیں اور بڑے زور کے ساتھ چیخی :۔

تم مجھ کو نہیں سمجھے۔ تم نہیں جانتے میں ایک بیاہی ہوئی لڑکی ہوں۔ اور کیا تم نے بھی

تعلیم پائی ہے کہ بیاہی ہوئی بہنوں سے عشق کرو۔ خالد! تم نے ایک ایسی حرکت کی ہے جس پر میں تمہیں کبھی معاف نہیں کر سکتی۔ چلے جاؤ یہاں سے اور آئندہ میرے پاس نہ آنا۔

اور خالد یہ ساری باتیں سُنا کیا۔ اس نے اس کے ہاتھ تو چھوڑ دیئے مگر وہاں سے غائب نہیں ہوا۔ شاید وہ ان جواں مردوں میں سے نہیں تھا، جن کے نزدیک غیرت بھی کوئی حیثیت رکھتی ہے مگر زبیدہ غیرت والی تھی وہ نہیں اُٹھا۔ تو وہ خود اُٹھ گئی۔ اور گو مریم اس کی ہم ذوق نہ تھی۔ مگر عورت تھی اسی کی طرح مظلوم۔ اس نے اندر پہنچتے ہی اس کے گلے میں باہیں ڈال دیں اور بچوں کی طرح رونے لگی۔ مریم بڑے کرب میں مبتلا تھی۔ مگر اس کا یہ کرب اس روتی زبیدہ کو اپنے سینہ سے لگے دیکھ کر نہ جانے کہاں غائب ہو گیا۔ وہ بھی اس کے گلے میں باہیں ڈال کر رونے لگی۔ اور خالد صاحب ایسے بے شرم تھے کہ دروازہ میں کھڑے یہ تماشا دیکھا کئے۔

آج ان دونوں کے دلوں کی ندیاں سارے سوتے توڑ کر بہہ نکلی تھیں۔ اور وہ اس بُری طرح رو رہی تھیں جیسے رونا بھی ایک دلچسپ شغل ہے۔ یہ تو نرس سر پر آن کھڑی ہوئی ورنہ وہ پگلیاں تو شاید کبھی رُتی نہ تھکتیں۔

نرس نے ان دونوں کو سنبھالا، مریم کا رونا تو اس کی سمجھ میں آگیا مگر یہ زبیدہ بیگم کیوں رو رہی تھیں وہ غریب سمجھ نہ سکی۔ وہ حد سے زیادہ بدصورت تھی اور عمر کی اس منزل تک کسی مرد کی محبت میں گرفتار نہ ہوئی تھی، محبت تو بڑی چیز ہے کسی مرد نے اس کی طرف آنکھ اُٹھا کر دیکھا تک نہ تھا اور خود وہ اتنی بزدل تھی کہ اسے کسی مرد سے محبت کرنے کی جرأت ہی نہ ہوئی تھی اگر اس نے کبھی ایسی جرأت کی ہوتی تو زبیدہ کے رونے کے انداز سے بہت کچھ سمجھ جاتی۔

اور خالد، اب کچھ سہم گیا تھا، مگر تھا بے شرم، قریب نہیں آیا۔ اور جب گھر لوٹا تو ماں سے ساری بات کہہ ڈالی اور ماں نے زبیدہ کو کئی بد دعائیں دے ڈالیں۔ مگر ان بد دعاؤں کی اس زبیدہ کو

کیا ضرورت تھی۔ وہ تو اپنا سب کچھ کھو چکی تھی۔ اب تو اس کے پاس کوئی ایسی چیز باقی ہی نہ رہی تھی جس کے کھو جانے کا اسے غم ہوتا۔

نرس نے مریم کو پے در پے تین انجکشن دیئے۔ وضعِ حمل کا وقت بہت قریب آ گیا تھا۔ اور مریم ماہیٔ بے آب کی طرح تڑپنے لگی تھی۔

اور اس بُری طرح چیخ رہی تھی جیسے اسے یا تو انگاروں پر لوٹایا جا رہا ہے یا اس کے جسم کی رگ رگ میں بچھو کاٹ رہے ہیں۔ یہ بڑی اذیت تھی۔ دکھ کا ہولناک جہنم تھا جو اس مریم کے جسم اور دماغ پر مسلط ہو گیا تھا۔ اس کا جوان اور چنچل جسم اس طرح چیخ رہا تھا جیسے چیخ چیخ کر بوٹی بوٹی میں تبدیل ہو جانے والا ہے۔ وہ اپنے ہاتھوں اور بازوؤں کو دیوانہ وار کاٹ رہی تھی۔ سینہ پر دو ہتھڑ یں مار رہی تھی اور روتے روتے دل کے ساتھ چاہ رہی تھی اس کی بدنصیب زندگی کا تار اسی لمحہ اور اسی آن ٹوٹ جائے۔ اور اس نے قریب قریب بے حس دماغ کے ساتھ فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ آئندہ کسی مرد کے قریب نہیں جائے گی یہ مرد جوان لڑکیوں کو اپنے آغوش میں لے کر کس مصیبت میں مبتلا کر دیتے ہیں۔ وہ اپنے خدا سے رو رو کر کہہ رہی تھی۔ میرے خدا میرے اس قصور کو ایک بار معاف کر دے، میں تیری ہر بڑائی، تیری ہر خوبی اور تیری ہر حکمت کی قسم کھاتی ہوں۔ میں آئندہ کبھی کسی مرد سے ہم آغوش نہ ہوں گی، مجھے ایک بار معاف کر دے۔

مگر وہ بوجھ، جو اس کی نسائیت نے مرد سے ایک بار نہیں کئی بار مل کر اپنے رحم پر لاد لیا تھا، آہستہ آہستہ باہر کی طرف سرک رہا تھا۔ اور مریم کی اذیتیں ایک دم اس پر یورش کر آئی تھیں۔ اور وہ اس بکری کی طرح چیخنے لگی تھی جس کی کھال ذبح کرنے کے بغیر کھینچی جا رہی ہو۔

زبیدہ نے اپنی عمر میں کبھی ایسی تکلیف نہیں دیکھی تھی اس نے اپنے سامنے کبھی کسی کو اس طرح تڑپتے بلکتے اور چیخنے نہیں دیکھا تھا۔ اس کی زبان گنگ تھی۔ مگر دونوں بازو مریم کے سر کو اپنی گرفت

میں لئے تھے اور آنکھیں رو رہی تھیں۔ مگر یہ زبیدہ کتنی انوکھی تھی، کہ مریم کے اس کرب اور بے چینی کے مشاہدہ کے باوجود یہ چاہ رہی تھی، اے کاش شادی کی رات اس کا ذہنی محبوب اس کے رحم پر بھی ایک بوجھ لاد جاتا اور آج وہ بھی مریم کی طرح تڑپتی بلکتی۔

وہ اس مریم سے ہزار گنا زیادہ تکلیف اٹھانے کے لئے تیار تھی۔ اسے اسی عالم میں موت منظور تھی۔ وہ یہ برداشت کر سکتی تھی کہ اسے اسی عالم میں ایک لاکھ فٹ کی بلندی پر سے نیچے پھینک دیا جاتا اور اس کے جسم کی ایک ایک بوٹی دھنی ہوئی روئی کی طرح فضا میں پھیل جاتی۔ مگر وہ خوش ہوتی۔ اس کی روح کی ہر گہرائی میں سے خوشی کے نغمے بلند ہوتے۔ اس کے لئے یہ کم خوشی ہوتی کہ وہ اپنے محبوب کی بخشی ہوئی دولت کو نو مہینے اپنے پیٹ میں اٹھائے اٹھائے پھری اور پھر یہ دولت، اس کے محبوب کے جسم، جوانی، رعنائی اور حسیات وجذبات کا نچوڑ تھی۔ اس کا محبوب سارا کا سارا اس سرمایہ میں کھنچ آیا تھا۔

کتنا انوکھا تخیل تھا اس زبیدہ کا اور کیسی انوکھی تھی وہ، جو مریم کے اس عالم کرب بے چینی میں یہ بات چاہ رہی تھی۔ دوسری عورتیں تو ایسے وقت کانپ کانپ کر کانوں پر ہاتھ رکھ لیتی ہیں اور دل کی ہر گہرائی سے چاہتی ہیں کہ یہ وقت ان پر کبھی نہ آئے۔

مریم نے بچہ جن دیا، اور خود بے ہوش ہو گئی۔ اور یہ بچہ باہر آتے ہی چیخنے اور چلانے لگا تھا۔ یہ شاید آدم کی ہر اولاد کی ریت تھی، ابدی اور ازلی ریت جسے وہ پورا کر رہا تھا۔ یا یہ احتجاج تھا قدرت کی اس ستم ظریفی کے خلاف، کہ وہ ہر آدم زادے کے بارے میں جبر سے کام لیتی ہے۔ اپنی مطلق العنانی کا ثبوت دیتی ہے۔ سکھا شاہی کرتی ہے اور آدمی سے اس کی پیدائش سے پہلے اس کی رائے نہیں لیتی۔ گوشت پوست کے اس لوتھڑے کی رائے۔ جو آیندہ چل کر،

چماروں، اپاہجوں، لولوں اور محتاجوں کے گروہوں میں شامل ہوگا۔

مگر گوشت کا یہ لوتھڑا جسے مریم نے ہزار صعوبت کے بعد جنا تھا، ابھی چیخ اور چلّا رہا تھا۔ اور نرس نے، اس حقیر بچے کو چپ کرانے کے لئے، اس کے منہ میں شہد میں بھیگا ہوا روئی کا پھایا رکھ دیا تھا اور یہ چپ ہو گیا تھا۔

اگر اس وقت روحانیات سے بحث کرنے اور روح اور مذہب کو مقدم جاننے والے گروہ کا کوئی فرد وہاں ہوتا تو بی زبیدہ اسے، اس گوشت کے لوتھڑے کے قریب لے جاکر اس کا انگوٹھا، اس کے منہ میں دے دیتی۔ اور جب یہ لوتھڑا روئی کے پھائے کی بجائے اس کے انگوٹھے کو چوسنے لگتا تو اسے محسوس ہوتا، کہ آدمی جب پیدا ہوتا ہے تو بھوک وہ پہلی حقیقت ہوتی ہے۔ جو شعوری، یا غیر شعوری طور پر اس پر کھلتی ہے۔ اور یہ حقیقت دن بدن، ہفتے بہ ہفتے، ماہ بماہ اور سال بہ سال مشاہدہ کی کرنوں کے ساتھ ناچ ناچ کر ہزاروں پہاڑوں جتنی بڑی ہو جاتی ہے۔ اور آدمی اس تلے دب کر رہ جاتا ہے۔

مگر زبیدہ کو اس وقت اس قسم کی خشک بحث کی ضرورت نہ تھی۔ اس نے نرس کی گود میں سے اس بچے کو لے لیا تھا۔ اور اس ماممتا کے اثر کے ماتحت جو ہر عورت کے سینہ میں رکھی گئی ہے۔ اس بچہ کو اپنے دل سے قریب کرنے لگی تھی، کیسا نامبارک تھا یہ بچہ، کہ اس کی پیدائش پر اس کی ماں کو نہ کوئی مبارک باد دینے آیا اور نہ کسی نے خوشی کے کلمات کہے۔ اور خود یہ مریم تو ہوش و حواس میں آنے کے بعد سے ایک ایسی شرم اپنے اوپر مسلّط پا رہی تھی۔ جس کی علامتیں اس نے پہلے کبھی دیکھی نہ تھیں اور اس بدنصیب کا جی تو یہ چاہ رہا تھا کہ وہ اس بچے کو جسے دنیا حرام کی اولاد کہتی ہے اپنے ہاتھوں سے ذبح کردے۔ اور اس کی ایک ایک بوٹی کاٹ کر اس بھری کائنات میں پھیلا دے اور چیخ چیخ کر کہے "اے دنیا والو! یہ وہ بچہ ہے، جسے تم حرام کی اولاد کہتے ہو۔ اور جس کی ماں تنتے ہوئے

میں تمہارے ہی مری جا رہی ہوں۔ اس لئے کہ اس کے باپ سے میرا نکاح نہیں ہوا تھا۔ تم نے اے کائنات میں بسنے والے لوگو، مجھے مجبور کر دیا ہے کہ میں ایسی بربریت کا مظاہرہ کروں، یوں میں ماں ہوں، اور یہ میں جانتی ہوں، تم نہیں جانتے کہ مجھے گوشت کے اس لوتھڑے سے کیسی محبت ہو سکتی ہے، مگر میری یہ ساری محبت ایک غصّہ میں بدل گئی ہے۔ اور میں اس بچّہ کو ایک لمحہ کے لئے بھی سانس لیتے دیکھ نہیں سکتی۔

مگر وہ کون تھی ایسی بات کہنے والی، وہ تو محض ایک اندھی جوانی تھی۔ وہ تو محض ایک احمق لڑکی تھی جو ایک فریب کار مرد کی جھوٹی باتوں میں آگئی تھی اور اس جیسی لڑکیاں اس کائنات کے اندر کروڑوں کی تعداد میں ہر بستی، ہر قریہ اور ہر شہر میں پھیلی ہیں۔ اور ہر آن یہی حرکتیں کرتی ہیں۔ ہر آن ویسے ہی دھوکے کھاتی ہیں، جیسا مریم نے، پہلی رات سرفراز سے کھایا تھا۔

نرس نے اسے دو انجکشن دے دیئے تھے، اسے کچھ حرارت سی ہو گئی تھی۔ اور یہ حرارت زچگی کے عالم میں کبھی کبھی زچّہ کی موت کا سبب بن جاتی ہے۔ خود مریم اسے جانتی تھی اور اس کا دل اس ڈر سے ڈوبنے لگا تھا، زندگی بھی کیا چیز ہے، ایک عجیب سی لذّت ہے کہ یہی مریم جو چند گھنٹے پیشتر رو رو کر اور بلک بلک کر اپنے خدا سے دعائیں کر رہی تھی، اور کہہ رہی تھی

اے خدا مجھے موت بخش دے

اب زندہ رہنا چاہ رہی تھی۔ اور اس بے غیرتی کے باوجود چاہ رہی تھی، جو اپنا خوفناک دامن پھیلائے اس کی طرف بڑھ رہی تھی۔

زبیدہ نے اس بچّہ کو اپنی گود میں ڈال لیا تھا اور اس کے عورت پن نے اسے اچانک ماں بنا دیا تھا۔ اور نہ جانے اسے کیا ہوا تھا۔ وہ ذہن ہی ذہن میں کچھ ایسا سمجھنے لگی تھی کہ مریم نے نہیں خود اس نے اس بچّے کو جنم دیا ہے۔ اور یہ سرفراز کا بچّہ نہیں منوّر کا بچّہ ہے۔ نرس بڑی حیران تھی

لیڈی ڈاکٹر صاحبہ نے بھی حیرت سے انگلی دانتوں میں داب لی تھی مگر، زبیدہ تو انوکھی تھی۔ اس نے گوشت کے اس لوتھڑے کو چھاتی سے لگا لیا تھا۔ اور یہ لوتھڑہ، اپنے ننھے ننھے ہاتھوں سے اس کی چھاتی کو ٹٹولنے لگا تھا۔

اور اس کی چھاتی ایک ماں کی چھاتی بنتی جا رہی تھی۔ اس میں جما ہوا خون اور چربی دُودھ کی شکل میں تبدیل ہو رہی تھی۔ اور زبیدہ کو ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے یہ چربی پگھل پگھل کر چوچیوں کی طرف دوڑ رہی ہے۔

اور بچے کو جب پہلی بار دُودھ پلایا گیا تو یہ مریم کا دودھ نہیں تھا، زبیدہ کا تھا اور جب یہ بچہ اس کی چھاتیوں سے چمٹا دُودھ چوس رہا تھا۔ تو وہ ایک لازوال مسرت پا رہی تھی۔ اور یہ مسرت اس احساس کے ساتھ مل کر لمحہ بہ لمحہ بڑھتی جا رہی تھی۔ کہ یہ بچہ مریم نے نہیں اس نے جنا ہے۔ اور منوّر نے شادی کی رات اس کی کوکھ ہری کی تھی۔ اور پھر بھاگ گیا تھا۔ اس کی اس دیوانگی کا علم جب اس کی خالہ کو ہوا تو اس نے اپنا سر پیٹ لیا۔ خالد کو گاؤں دوڑایا کہ ذیلدارنی اور سائرہ کو بلا لائے۔ وہ دونوں آئیں، زبیدہ کی اس دیوانگی کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تو چیخ چیخ اُٹھیں، مگر زبیدہ ہنس رہی تھی۔ قہقہے لگا رہی تھی اور ان اندھیوں سے کہہ رہی تھی۔

یہ بچہ تو میں نے جنا ہے۔ یہ تو میرے منوّر دولھا کا عطیہ ہے جو شادی کی رات اس نے مجھے عطا کیا تھا۔

ذیلدارنی اور اس کی بہن نے اپنے سفید بوڑھے بالوں کو نوچ نوچ لیا۔ مگر سائرہ دنگ تھی اسے حیرت تھی

کہ اس دنیا میں ایسی بھی اُونچی عورتیں پیدا ہو سکتی ہیں جیسی یہ زبیدہ تھی۔

اکیسواں باب

یہ دنیا بھی عجیب ہے۔ حد سے زیادہ کمینی اور برخود غلط۔ گو یہ حقیقت کوئی چھپی ہوئی بات نہ تھی کہ مریم نے حرام کا بچہ جنا ہے۔ مگر محض اس لئے کہ اس دیوانی زبیدہ نے اس بچہ کو گود لے لیا تھا اور یوں ہی اس کی ماں بن گئی تھی۔ دنیا یہ سچ مان گئی۔ اور حتیٰ کہ زبیدہ کی خالہ اور زیلدارنی کو بھی یہ وہم ہونے لگا تھا کہ یہ بچہ زبیدہ کی کوکھ سے پیدا ہوا ہے اور وہ مریم پر جھاڑ کر بالکل الگ ہو گئی تھی جس نے نہ جانے کتنی لمبی راتوں کی پیہم لذتوں کے بعد اس بچہ کو اپنے رحم میں پرورش کرنا شروع کیا تھا۔ اور پھر کن اذیتوں کے بعد اسے جنم دیا تھا۔

یہ ایک خوفناک لاوا تھا جسے زبیدہ اپنی گود میں بھر کر گاؤں آئی۔ ماں ٹوٹی ہوئی کھاٹ پر گر گئی۔ سرفراز نے اس بچہ کو زبیدہ کی گود سے چھین کر اس کی بوٹی بوٹی اڑا دینے کی بڑی کوشش کی۔ مگر دیوانی زبیدہ نے، یہ بچہ کسی طرح اس کے سپرد نہ کیا۔ اور سرفراز غصے سے کپکپاتے جسم کے ساتھ، زبیدہ کو ننگی ننگی گالیاں دیتا اپنے کمرہ میں آن چھپا۔ اور بستی میں تو جیسے کوئی چلتی پھرتی نمائش آ گئی تھی۔ کوئی ناٹک کمپنی اس احاطہ میں کھیل دکھا رہی تھی کہ بستی کی ایک ایک عورت یہاں آئی اور زبیدہ کو دیکھا، جو بچہ کو اپنی گود میں ڈالے اسے دودھ پلا رہی تھی وہ کسان عورتیں تھیں زبیدہ کی ہم پلہ نہ تھیں۔ اس لئے اس پر پھبتیاں تو نہ کس سکیں۔ زبان پر

طنز کے کلمات نہیں لائیں ۔ مگر آنکھوں سے سب کچھ کہہ دیا ۔ اور انگلیاں دانتوں میں دبا کر وہاں سے اس طرح لوٹنے لگیں جیسے وہ ایک کسبن کو دیکھ کر آئی ہوں ۔

اور یہ خبر، صابرہ زہرہ اور شاہ جی بابا کے کانوں تک بھی پہنچ گئی ۔ وہ حقیقت سے آگاہ نہ تھے ۔ انہیں ایک بار پھر ایک خوفناک غلط فہمی ہوئی وہ سمجھے، اپنی بیماری کے دوران میں منور نے یہ بوجھ اس عورت کے رحم پر لاد دیا تھا، جسے اس نے اس کے فرار کے بعد اُگل دیا ہے اور یہ ایک بڑی ندامت تھی یہ ایک حوصلہ شکن صدمہ تھا ۔ یہ تو ہزار قیامتوں کی ایک قیامت تھی اور اس قیامت نے اس بوڑھے کے دماغ اور دل کو جکڑ لیا ۔ اور وہ پلنگ پر گر گیا ۔

جینے کی آس جاتی رہی ۔ شرم اور ندامت نے صابرہ اور زہرہ کی پرورش کا خیال بھی دل سے نکال دیا ۔

صابرہ اور زہرہ بابا کے سینہ سے لپٹ لپٹ کر روئیں ۔ اور اسے اپنی موجودگی اور اپنی زندگی کا لالچ دے دے کر اسے اس صدمہ سے بچانا چاہا ـــــ مگر وہ ایسا صاحب فراش ہوا، کہ ساتویں دن دم توڑ دیا ۔

اور یہ خبر پھر بجلی کی طرح پھیلی ــــــ اور ذیلدارنی نے زبیدہ کے بال نوچ نوچ لئے ۔ اور نہ جانے کیوں چیخنے لگی ۔

ڈائن پہلے تو نے اپنے باپ کو کھایا اور اب شاہ جی بابا کو نگل گئی ہے ۔

اور زبیدہ کی دیوانگی اپنے حدود سے تجاوز کر گئی ۔ اس نے اس بچہ کو گود سے اُچھال کر دور دیوار پر دے مارا ۔ اور ننگے سر اور ننگے پاؤں ۔ شاہ جی بابا کے مکان کی طرف بھاگی ۔

صابرہ اور زہرہ شاہ جی بابا کی نعش سے لپٹی رو رہی تھیں ۔ اور اس زبیدہ نے تو ایسا کہرام مچایا، اس بُری طرح چیخی اس بری طرح روئی، کہ پاس کھڑی عورتیں بھی ضبط کی دیواریں

پھاند گئیں ۔

اندھیرے میں شاہ جی بابا کی نعش اٹھائی گئی ۔ سرفراز اور سائرہ نے زبیدہ کو اپنے بازوؤں میں بھینچ لیا تھا ورنہ وہ چیختی چلاتی جنازہ کے ساتھ بھاگ جاتی ۔

اور جنہوں نے اس زبیدہ کو اس واقعہ کے بعد دیکھا ۔ وہ اس کی حالت پر روتے ، نوحہ کرتے اور سوچتے ، یہ انسانی زندگی بھی ایک عجیب کھلونا ہے ۔ مٹی کا حقیر اور بے قدر کھلونا ۔ قدرت جس طرح چاہتی ہے اس سے کھیلتی ہے ۔ اور جب چاہتی ہے اسے توڑ دیتی ہے ۔

زبیدہ کی ساری عظمتیں سارے انوکھے پن ختم ہو گئے تھے ۔ اس کے احساس کی ہر کڑی ڈھیلی پڑ گئی تھی اور اب وہ ایک ٹوٹی ہوئی بیل کی طرح ، برآمدہ میں بچھے ہوئے ایک صوفہ پر پڑی رہتی اور کبھی کبھی آپ ہی آپ اپنی زلفوں کو نوچنے لگتی ۔ سائرہ اور ذمہ دارنی اس کے ہاتھ پکڑ لیتیں ۔ مگر زبیدہ اپنے آپ کو ان کی گرفت سے چھڑا لیتی ۔ اپنا سر دیوار سے دے دے مارتی اور اس طرح کرتے کرتے اس کے نازک نازک سر کا سارا حسن جاتا رہا تھا ۔ اور پیشانی پر کئی گھاؤ پڑ گئے تھے ۔ اور یہ گھاؤ بڑھتے ہی جا رہے تھے ۔

بائیسواں باب

اور وہ جو اس ساری تباہی کا سبب بنا تھا۔ ہر رات اور ہر دن کے اکثر حصوں میں اس دیو ہیکل عورت کی خوراک بنتے بنتے، زرد پڑتا جا رہا تھا۔ وہ ہر وقت آنسو بہاتا، مگر اس کے آنسوؤں کی پروا نہ کی جاتی۔ اور دیو ہیکل عورت، اس کی ہر رعنائی کو ٹھو کی کتیا کی طرح چاٹ رہی تھی۔

وہ تین بار وہاں سے بھاگا۔ مگر ہر بار پکڑا پکڑا آیا۔ اور وحشی عورت کی بربریت اور سفاکی باولے کتے کے باولے پن میں تبدیل ہو گئی۔

اب اس منوّر کے ہاتھوں میں چاندی کی ہتھکڑیاں اور پاؤں میں بیڑیاں پہنا دی گئی تھیں۔ اور یہ بیڑیاں صرف اس وقت کھلتیں جب باولی عورت کو اس کا جسم نوچنے کی ضرورت ہوتی اس کی ہتھکڑیوں اور بیڑیوں کی کنجی بڑی باندی کے پاس رہتی ... اور یہ بڑی باندی کبھی کبھی ایک رحم دل عورت بن جاتی۔ اور جب مالکہ لوٹ مار کرنے یا شکار کے لئے باہر جاتی تو وہ اس منوّر کی ہتھکڑیاں اور بیڑیاں کھول دیتی اور منوّر کو اجازت دیتی کہ وہ بارہ دری میں ٹہل لے۔

اور اس شام جب باہر بڑے زور کی بارش ہو رہی تھی۔ ہوا کے جھکڑ چل رہے تھے اور ایسا معلوم ہوتا تھا، کہ قدرت کے غصّہ کی آگ بہت بُری طرح بھڑک اٹھی ہے۔ مالکہ ابھی لوٹ مار سے

واپس نہیں آئی تھی۔ بڑی باندی نے منور کی بیڑیاں اور ہتھکڑیاں کھول دی تھیں، اور منور بڑھیا کی آنکھ بچا کر، اس اصطبل کے قریب آن پہنچا تھا۔ جہاں مالکہ کی خوفناک اور ہوا کی طرح اڑنے والی گھوڑیاں بندھی تھیں۔

نہ جانے اس منور کو کیا ہوا، اس نے ایک گھوڑی کھول لی۔ گھوڑی بہت زور سے ہنہنائی، مگر اس کی آواز کا شور ہوا کے طوفانی تھپیڑوں اور بارش کے شور میں گم ہو گیا۔

منور اس پر لد گیا تھا، اور گھوڑی بڑے پھاٹک سے ہوتی اس سڑک پر بڑھ رہی تھی جو دور جنگلوں میں سے ہوتی دو سو میل کا چکر کاٹتی ہرہ پہاڑی کی طرف بڑھی چلی گئی تھی۔

اسے اپنے آپ کا ہوش نہ تھا۔ صرف اس کے بازوؤں نے باگیں کھینچ رکھی تھیں اور گھوڑی بارش اور ہوا کے تھپیڑوں کو چیرتی، خود ایک طوفان بن گئی تھی۔

اور ادھر جب، مالکہ اور اس کے ساتھی لوٹ مار سے واپس آئے۔ تو بڑی باندی، سر کے بل گری رو رہی تھی۔

مالکہ کی ساری بربرنیں، ساری سفاکیاں جاگ اٹھی تھیں اور اس نے آپ اپنے ہاتھوں سے اس بڑھیا کی کھال کھینچی۔ اور اس طوفانی اور اندھیری رات میں اپنے سوار، ہر طرف دوڑا دیئے کہ اس چھوکرے کو پکڑ لائیں۔

مگر اس ڈراونی رات کا دامن بڑا وسیع تھا۔ وہ ساری رات سر پٹخنے کے باوجود منور کو تلاش نہ کر سکے۔ اور چونکہ جانتے تھے کہ ناکام واپسی ہر حال میں موت کا حکم رکھتی ہے، اس لئے وہ آپ بھی، اس اندھیری رات کے دامن میں کھو گئے۔

اور جب صبح ہوئی، اور پھر صبح سے دوپہر، اور پھر رات بھی آگئی۔ اور نہ منور واپس

آیا اور نہ پہرہ داری لوٹے ، تو اس سفاک اور جابر عورت نے کوڑہ ہاتھ میں لے کر ایک ایک باندی اور ایک ایک پہرہ دار کی کھال ادھیڑ ڈالی -

---

مگر ادھر منوّر ،پہرہ پہاڑی کی وسعتوں کو پھلانگتا ، اس ڈھلوان کی طرف اتر رہا تھا، جو آبادی کی طرف بھاگ رہی تھی -

یہ رات بھی اندھیری تھی ، مگر طوفانی نہ تھی - اور اس اندھیری رات کے دامن میں چھپے ، منوّر کی گھوڑی ، صابرہ اور زبیدہ کے مکان کے دروازہ پر آن رکی - منوّر اترا نہیں کودا اس کا جسم اور حواس تو اس وقت شعلہ بہ دامن تھے - اس لئے تھکن محسوس نہیں کر رہے تھے۔

مگر گھوڑی تو غریب عشق کی آگ میں جل نہیں رہی تھی - اس لئے منوّر جیسے ہی اس سے کودا ، وہ وہیں گر پڑی ، جہاں رکی تھی -

اور اندر اس منوّر کا استقبال ایک نئی شان اور نئی آن بان سے ہوا -

ذیلدارنی ، سرفراز ، سائرہ ، رحیمن - مریم - رابعہ اور بستی کی کئی عورتیں جنہوں کہ ، بی زبیدہ ، مری ہوئی صابرہ کی نعش کے آس پاس بیٹھیں ، آنسو بہا رہی تھیں -

منوّر نے اندر قدم رکھا - وہ بہت بدلا ہوا تھا - اس کے حواس اور چہرہ پر وحشت مسلط تھی - اس نے ایک ہی نظر میں ہر بات پالی - اور اڑتا اور ان سے ٹکراتا ہوا اس صابرہ پر آن گرا - اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا - اور نہ جانے اس دیوانی زبیدہ کو کونسی بجلی چھو گئی وہ اپنی جگہ سے بڑی تیزی کے ساتھ اچھلی اور اس منوّر سے لپٹ گئی -

یہ بھی عجیب منظر تھا ، اور یہ منظر تو اس وقت انتہائی خوفناک صورت اختیار کر گیا جب صابرہ کا جنازہ قبرستان لایا گیا - منوّر ہوش و حواس کی ساری سرحدیں پھلانگ

چکا تھا۔ صابرہ کی نعش سے لپٹ لپٹ گیا۔ مگر لوگوں نے اسے بہت سختی کے ساتھ نعش سے پرے ہٹا دیا اور نعش سپردِ خاک کر دی۔

وہ رات، ہیرہ آباد کی تاریخ میں ایک یادگار رات تھی۔ بستی کے سارے لوگ قبرستان میں رہے اس لئے کہ منوّر بار بار قبر کو کھودنے لگتا تھا۔

اور اس رات کے بعد، شاید حوادث کا طوفان تھم چکا تھا اور جابر قدرت کی بھوک مٹ چکی تھی کہ منوّر نے پھر یہ قبر نہیں کھودی۔ وہ اس قبر سے چند قدم کے فاصلے پر بیٹھ گیا۔ ہر آن آنسو بہاتا، کبھی کبھی بال نوچتا، آہیں بھرتا۔ اور پھر کبھی آپ ہی آپ ہنسنے لگتا۔

اور اس سے چند قدم کے فاصلے پر زبیدہ بیٹھی تھی۔ وہ بھی اسی کی طرح پاگل ہو گئی تھی۔

بستی کے لوگ ——— سائرہ، سرفراز، اور زہرہ، اور کبھی کبھی ذیلدارنی وہاں آتے۔ ان دونوں دیوانوں کو دیکھتے اور آنسو بہاتے لوٹ جاتے۔ منوّر بہت کم کھاتا۔ صبح و شام زہرہ زبیدہ کے گھر سے ان کے لئے کھانا لے کر آتی۔ منوّر کبھی کبھی کھانے کی ٹرے اٹھا کر دور پھینک دیتا۔

مگر کبھی کبھی جب زبیدہ اس کے سامنے رکوع کے بل جھک جاتی۔ اور آنکھوں سے آنسوؤں کی ندیاں بہانے لگتی، تو منوّر دو ایک لقمے کھا لیتا۔

اور ان کی زندگی کے دن یوں ہی بیتتے جا رہے تھے۔ اور جابر قدرت شاید کوئی نئے کھلونے تلاش کر رہی تھی۔

مطبوعات کتب خانہ تاج آفس بمبئی

شاعرِ انقلاب حضرت جوشؔ کے مجموعے

سنبل و سلاسل — تازہ کلام چھپ کر شائع ہو گیا ... چار روپے

شعلہ و شبنم — مشہور مجموعہ .. پانچ روپے

نقش و نگار — مجموعہ کلام تین روپے آٹھ آنے

عرش و فرش — ,, چار روپے

جنون و حکمت — رباعیات کا مجموعہ تین روپے

حرف و حکایات ... تین روپے

فکر و نشاط ... دو روپے آٹھ آنے

اشارات — مضامین کا مجموعہ دو روپے

شاعر کی راتیں ... ایک روپیہ چار آنہ

حسین اور انقلاب (دو نغمات کربلا نظم) ایک روپیہ

سیف و سبو ... چار روپے

آیات و نغمات ... تین روپے

روحِ ادب ... دو روپے آٹھ آنے

حرفِ آخر ... چھ روپے

حیات محمد علی جناح

ملک کے نامور سوانح نگار رئیس احمد جعفری جنہوں نے آج سے بارہ سال قبل مولانا محمد علی مرحوم کے سوانح حیات لکھے تھے۔ انہوں نے آج دوسرے محمد علی یعنی قائد اعظم کے سوانح حیات مرتب فرمائے ہیں ضخامت پونے نوسو صفحات مجلد سات روپے آٹھ آنے

باغی — رئیس احمد جعفری کا حیرت آفرین ناول چار روپے بارہ آنے

رشید اختر ندوی کے ناول

جو ملک کے ہر حصے میں مقبول ہوئے

نسیم — ناول — تین روپے آٹھ آنے

نشانِ راہ — ,, — تین روپے آٹھ آنے

کانٹوں کی سیج — ,, — تین روپے آٹھ آنے

تشنگی   ناول   چار روپے

تلخیاں   "   تین روپے آٹھ آنے

بادوباراں   "   تین روپے

نشیمن   "   تین روپے آٹھ آنے

حسن و شباب :- ماہر القادری کے چیدہ
خاص افسانے   دو روپے

حدیث دیگراں :- ملک کے مایہ ناز نوجوان
شاعر حضرت خمار بارہ بنکوی کے
کلام حیات افروز کا مجموعہ
دو روپے

عشق و محبت :- تمام مشہور شعراء کا
صرف عشق و محبت کے متعلقہ کلام
کا انتخاب ... دو روپے آٹھ آنے

عشقیہ کلام :- منتخب عشقیہ کلام
بارہ آنے

نقش و نگار :- فلمی دنیا کے امام
جناب ضیا سرحدی کے دو لاجواب
ڈرامے ... دو روپے

تا حد نگاہ :- ناول حضرت ضیا سرحدی کا
ایک دل کش اور لاجواب ناول
ہے۔   چار روپے

وادیاں :- ماہنامہ ایشیا کے بہترین
ڈرامے مرتبہ ساغر نظامی
تین روپے

چیتو :- ماہنامہ ایشیا کے بہترین افسانے
مرتبہ ساغر نظامی   پانچ روپے

موج و ساحل :- ساغر نظامی کے تازہ
کلام کا مجموعہ   چار روپے بارہ آنے

بادۂ مشرق مکمل :- ساغر نظامی
پانچ روپے آٹھ آنے

آگ :- ناول عزیز احمد مصنف ہوس
گریز وغیرہ، عزیز احمد کا یہ ناول
ان کا حیرت انگیز شاہکار
ہے .... تین روپے

مقالات ماجد :- مولانا عبدالماجد
دریابادی کے مقالات و مقدمات کا
بہترین ادبی مجموعہ   تین روپے آٹھ آنے